دعوت دین

اور

اس کا طریقۂ کار

مولانا امین احسن اصلاحی

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

یہ کتاب میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے محرم ۱۳۶۵ھ سے لے کر جمادی الاوّل ۱۳۶۶ھ تک ترجمان القرآن میں لکھے۔ یہ مضامین ایک سلسلہ کے ساتھ ایک تصنیف کا خاکہ سامنے رکھ کر لکھے گئے تھے، اور یہ خیال تھا کہ رسالہ میں یہ سلسلہ جب پورا ہو جائے گا تو نظرِ ثانی اور ضروری حذف و اضافہ کے بعد اس کو کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے گا۔ چنانچہ تقسیم ہند سے پہلے میں نے اس پر نظرِ ثانی کر کے مسوّدہ کاتب کے حوالہ کر دیا تھا۔ لیکن تقسیم کے بعد جو طوفان اُٹھا اس میں کاتب صاحب اس کا مسوّدہ اور اس کی لکھی ہوئی کاپیاں سب اپنے وطن میں چھوڑ کر پاکستان چلے آئے۔ پاکستان آ کر مجھے پھر ان اوراقِ پریشاں کو جمع کرنے اور ان پر نظرِ ثانی کرنے کی فکر ہوئی۔ لیکن ابھی میں کہیں جم کر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ اکتوبر ۴۸ء میں حکومت پنجاب نے سیفٹی ایکٹ کے ماتحت مجھے گرفتار کر لیا۔ میری گرفتاری کے بعد اس کی نظرِ ثانی سے مایوس ہو کر جماعتِ اسلامی ہند نے اس کو جوں کا توں شائع کر دیا۔ جب جیل میں یہ کتاب مجھے ملی تو ایک طرف اس کی اشاعت سے خوشی ہوئی تو دوسری طرف اس کی حالت دیکھ کر تھوڑی سی تکلیف بھی ہوئی۔ اوّل تو اس پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے جگہ جگہ عبارت اُلجھی ہوئی تھی۔ ثانیاً اس کی ترتیب اس نقشہ کے خلاف تھی جو میرے پیشِ نظر تھا، اس وجہ سے کتاب کا معنوی نظم درہم برہم ہو گیا تھا۔ ثالثاً شائع کرنے والوں نے اس میں بعض ایسی ترمیمیں کر دی تھیں جو میرے منشاء کے خلاف تھیں۔ ان اسباب سے میں نے ضروری خیال کیا کہ میں اس پر نظرِ ثانی کر کے اس کے آئندہ ایڈیشن کو ان خرابیوں سے محفوظ کرنے کی کوشش کروں۔ چنانچہ میں نے جیل ہی میں اس کا مسودہ منگا کر اس پر نظرِ ثانی کی اور اب یہ میری نظرِ ثانی کے بعد شائع کی جا رہی ہے۔ میرے پیشِ نظر خاکہ کے لحاظ سے اب اگر اس میں کوئی کمی ہے تو یہ ہے کہ اس میں چند

مضامین اور ہونے چاہئیں، ورنہ کتاب تشنہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس نقص کی تلافی اس وقت میرے لیے مشکل ہے۔ اس وقت سامنے کے کام اتنی فرصت نہیں دیتے کہ پچھلے کئے ہوئے کاموں پر اطمینان کے ساتھ نگاہ ڈالی جاسکے۔ تاہم میں اس کام سے غافل نہیں رہوں گا۔ آئندہ ایڈیشن میں خدا نے چاہا تو یہ کمی پوری ہو جائے گی۔

اس کتاب میں انبیائے کرام کا طریقۂ تبلیغ میں نے تفصیل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانہ میں جس طرح دین کا مفہوم لوگوں کے ذہن میں ادھورا اور ناقص ہے۔ اسی طرح دین کی تبلیغ کا مفہوم بھی بہت ہی محدود اور غلط ہے۔ میں نے اس کتاب میں دین کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے (جیسا کہ وہ فی الواقع ہے) سامنے رکھا ہے، اور اسی حیثیت سے اس جدوجہد کے تمام تقاضوں اور اس کے تمام مراحل کی تفصیل کی ہے جو اس نظام کو برپا کرنے کے لئے اختیار کرنی پڑتی ہے۔ میں نے اس کتاب کی ہر فصل کی بنیاد قرآن مجید کے محکم دلائل پر رکھی ہے اور جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے صحیح احادیث سے اس کی وضاحت کی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جو لوگ اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے وہ اس کو اس کے مخصوص مباحث کے سوا فہمِ قرآن میں بھی معین پائیں گے اور یہی پہلو اس کا اصلی قیمتی پہلو ہے۔

اکثر احباب کو مجھ سے یہ شکایت رہی ہے کہ میں ادائے مطلب میں بہت اختصار سے کام لینے کا عادی ہوں، اور اس بات کی کچھ زیادہ پروا نہیں کرتا کہ ہر پڑھنے والا بات کو اچھی طرح سمجھ جائے۔ اس کتاب میں ایک حد تک میں نے اپنے اوپر سے اس الزام کو دُور کرنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کرے مجھے اس میں کامیابی ہوئی ہو اور لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھا سکیں۔

امین احسن

لاہور، جون ۱۹۵۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی غلطیاں

تبلیغ کا لفظ سنتے ہی قدرتی طور پر آدمی کا ذہن ان تدبیروں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو مدّتوں سے مسلمانوں میں تبلیغِ دین کے لیے رائج و مقبول رہی ہیں ایک زمانۂ دراز کا تعامل جب کسی کام کے لیے کسی طریقۂ کار کو متعیّن کر دیتا ہے تو دلوں پر اس کا ایسا سکّہ بیٹھ جایا کرتا ہے کہ لوگ اس سے علیٰحدہ ہو کر کچھ سوچ ہی نہیں سکتے وہی طریقہ اس کام کے انجام دینے کا بالکل قدرتی ذریعہ خیال کیا جانے لگتا ہے، اور جو شخص بھی اس کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہے وہی طریقہ اختیار کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بسا اوقات آدمی اس سے بچنے کا ارادہ کر کے گھر سے نکلتا ہے لیکن چلتے چلتے پاؤں آپ سے آپ پھر اسی پٹے ہوئے راستے پر پڑ جاتے ہیں جس سے بچنے کا ارادہ کر کے وہ گھر سے نکلا تھا۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ پہلے موجودہ طریقۂ تبلیغ کی غلطیاں اختصار کے ساتھ بیان کر دی جائیں۔

ہمارے نزدیک مروّجہ طریقۂ تبلیغ میں علمی اور عملی دونوں قسم کی غلطیاں ہیں، جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ طریقۂ تبلیغ اپنے فلسفہ کے اعتبار سے بھی غلط ہے اور اپنے طریقۂ کار کے پہلو سے بھی غلط ہے، اور یہی وجہ ہے کہ تبلیغ اسلام کے نام سے اب تک جتنی جدوجہد بھی کی گئی ہے وہ بیشتر نہ صرف یہ کہ اصل مقصد کے لحاظ سے لاحاصل رہی ہے بلکہ الٹے اس سے اسلام کی دعوت کو سخت نقصان پہونچا ہے۔ ہم پہلے اس طریقہ کی علمی غلطیوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی علمی غلطیاں

پہلی غلطی سب سے بڑی غلطی جواب تک اسلام کو پیش کرنے میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پیش کرنے والوں نے اپنا اور اسلام کا صحیح موقف نہیں سمجھا اور اسلام کو اس حیثیت سے نہیں پیش کیا جس حیثیت سے اس کو قرآن نے پیش کیا تھا۔ قرآن نے اس کو اس حیثیت سے پیش کیا تھا کہ ابتدائے آفرینش سے خدا کا دین یہی ہے تو جب کبھی بھی اور جس قوم میں بھی خدا نے اپنے کسی نبی کو بھیجا ہے اسی دین کے ساتھ بھیجا ہے۔ قومیں خدا کے بھیجے ہوئے اس دین میں برابر خرابیاں پیدا کرتی رہی ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے ذریعہ سے ان خرابیوں کی اصلاح کرتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے آخری رسول ؐ کے ذریعہ سے اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کے اس دین کو بالکل صحیح اور مکمل صورت میں نازل کر کے اس کو ہمیشہ کے لیے ہر طرح کی آمیزش اور ہر قسم کی تبدیل و تحریف کے خطرہ سے محفوظ کر دیا۔ یہ دین قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے، یہ کسی خاص قوم کا دین نہیں ہے بلکہ تمام بنی نوع آدم کا دین اور خدا کے تمام نبیوں کا لایا ہوا دین ہے، جو اس کو مانے وہ مسلم ہے، جو نہ مانے وہ غیر مسلم ہے۔ یہ نہ تو خدا کے کسی رسول کی تکذیب کرتا، نہ اس کی کسی کتاب کا انکار کرتا، نہ کسی پر اپنی مطلق فضیلت کا مدعی ہے اس کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ یہ تمام نبیوں کی تعلیم کا قابل اعتبار مجموعہ اور ان کی تعلیموں کو مکمل کرنے والا ہے۔ لیکن ہمارے مبلّغوں اور مصنّفوں نے اس کے بالکل برعکس اس کو مسلمان قوم کے دین، اور دنیا کے تمام دوسرے ادیان کے ایک حریف کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس کی سچائی ثابت کرنے کے لیے دوسری آسمانی کتابوں کی تعلیموں کا مذاق اڑایا۔ اور بسا اوقات اس جوش میں اس قدر حد سے آگے بڑھ گئے کہ ان تعلیمات کا بھی مذاق اڑایا جن پر ایمان لانے کی سب سے زیادہ ذمّہ داری، بحیثیت مسلم اور تمام انبیاء کے مصدق ہونے کے، خود ان پر عائد ہوتی تھی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کا مقابلہ کرکے دوسرے انبیا کو کہتر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں اس طرح کی مطلق ترجیح و تفضیل کی صریح ممانعت کی گئی تھی اور یہ تعلیم دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کے جو پہلو تھے وہ تعین کے ساتھ واضح کر دیئے گئے تھے اور خود حضورؐ نے تاکید کے ساتھ ممانعت فرمائی تھی کہ دوسرے انبیاء کے مقابل میں آپؐ کیلئے مطلق فضیلت کا دعویٰ نہ کیا جائے۔ لیکن مسلمانوں نے اسلام اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک اندھی بہری عصبیتِ قومی کے جوش کے ساتھ پیش کیا اور اس غلطی کا ارتکاب صرف واعظوں اور مبلغوں نے ہی نہیں کیا بلکہ ہمارے ان بڑے بڑے مصنّفین و مؤلفین نے بھی کیا جن کی کتابیں مسلموں اور غیر مسلموں دونوں کے لیے اسلام کے سمجھنے کا واحد ذریعہ تھیں۔ آپ اپنے تمام بڑے بڑے مصنّفوں کی وہ کتابیں اٹھا کر دیکھئے جو اسلام پر لکھی گئی ہیں ان میں دوسرے انبیاء اور ان کی تعلیمات کی نسبت ایسے زہر آلود فقرے آپ کو ملیں گے جن کو پڑھ کر صاف محسوس ہوگا کہ مسلمان بھی اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کی اسی بیماری میں مبتلا ہو گئے ہیں جن میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہو گئے تھے۔ لیکن مسلمانوں نے اس طرح کی کتابوں کو عزّت و احترام کے ہاتھوں لیا اور اس طرح کے واعظوں کی تقریریں داد و تحسین کے ساتھ سُنیں، کیونکہ اس سے ان کے قومی کبر و غرور کو شہ ملتی تھی۔ برعکس اس کے جن لوگوں کی تحریروں اور تقریروں میں یہ چاشنی نہیں تھی وہ نہ تو عوام ہی میں کچھ حسنِ قبول حاصل کر سکے نہ خواص ہی میں ان کی کچھ وقعت ہوئی۔ اس سے انکار نہیں کہ زہر آلود تبلیغی لٹریچر پیدا کرنے میں کچھ دخل ان لوگوں کو بھی ہے جنہوں نے اسلام کے خلاف بدزبانیاں کی ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی مسلمانوں ہی کی غلطی ہے کہ انھوں نے شر کا جواب شر سے دے کر شیطان کی فتنہ انگیزیوں میں اس کے ساتھ تعاون کیا۔ ان غلطیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کے دلوں میں کدورت پیدا ہوئی اور انھوں نے اسلام پر اس حیثیت سے غور کر نہیں کیا کہ یہ ان کو ان ہی کی بھلائی ہوئی سچائیوں کو یاد دلانے اور ان ہی کے نبیوں اور

رسولوں کے ورثہ کو ان کی طرف منتقل کرنے آیا ہے بلکہ اس کو ایک حریف اور رہزن کی طرح نفرت کی نگاہ سے دیکھا جو ان سے ان کے دین دھرم کو چھین کر ان کے اوپر خود مسلّط ہونا چاہتا ہے۔

دوسری غلطی

اسلام کو پیش کرنے میں دوسری علمی غلطی یہ کی گئی کہ اس کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے نہیں پیش کیا گیا جو زندگی کے سارے انفرادی و اجتماعی اور مابعد الطبیعی مسائل کو ایک وحدت میں پروتا اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے۔ بلکہ سارا زور ہمارے مبلّغوں اور مناظروں نے چند ایسے مسائل پر صرف کیا جو عیسائیوں یا ہندوؤں کے ساتھ مذہبی تصادم سے پیدا ہو گئے تھے۔ مثلاً روح اور مادّہ کے حدوث و قدم کی بحث، تناسخ کا مسئلہ، الوہیتِ مسیحؑ، اور تثلیث کا جھگڑا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کے مسائل سے ہر فرقہ کے تھوڑے سے پیشہ ور مناظروں کو دلچسپی ہوتی ہے جن کی اصلی کامیابی ان کے حل کرنے میں نہیں بلکہ ان کو زیادہ سے زیادہ اُلجھا دینے میں ہوتی ہے۔ ان لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کرنا اپنی قوت وقابلیت کو ضائع کرنا اور اپنے وقت کو برباد کرنا ہے۔ لیکن ہمارے مبلّغین نے زیادہ تر اسی طرح کے معرکوں میں زندگیاں بسر کر ڈالیں۔

انھیں اس بات پر غور کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی کہ یہ مسائل تو صرف چند انسانوں کی دلچسپی کے ہیں اور وہ بھی ان کو حل کرنا نہیں چاہتے بلکہ اُلجھانا چاہتے ہیں باقی ساری دنیا کے سامنے تو آج کل دوسرے ہی مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لیے دنیا بے چین بھی ہے اور جن کے حل ہونے ہی پر دنیا کی نجات کا انحصار بھی ہے، اور جو مذہب بھی آگے بڑھ کر ان مسائل کا قابلِ قبول حل پیش کر دے گا وہی ساری دنیا کا مذہب بن سکے گا۔ ایک ایسی دنیا میں جو اپنے ایجاد کئے ہوئے طریقوں کو آزما کر تھک چکی ہو اور زندگی کے تمدّنی و اجتماعی مسائل کا کوئی حل نہ پا رہی ہو، اگر اسلام کو محض چند عقائد اور رسوم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مکمل نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا جاتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی بدل جاتا، لیکن ہمارے اندر سے جو

حضرات تبلیغ اسلام کا مقصد لے کر اُٹھے یا جنہوں نے اسلام پر کتابیں لکھیں شاید ان کے سامنے مذہب کا مسیحی تصوّر تھا۔ یعنی مذہب صرف چند اذعانیات کا مجموعہ ہے، زندگی کے عملی مسائل سے اس کو کوئی اثباتی تعلق نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح مسیحیّت کی لایعنی موشگافیوں سے دنیا کے ذہین طبقہ نے کوئی دلچسپی نہیں لی اسی طرح اسلام کے ان مسائل کی طرف بھی پڑھی لکھی دنیا نے کوئی توجہ نہیں کی اور تبلیغِ اسلام کی یہ ساری ہما ہمی، رسمی مذہبیت کے تھوڑے سے پرستاروں کے اندر محدود ہو کر رہ گئی۔ اضاعتِ وقت و مال کے سوا اس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔

تیسری غلطی اس سلسلہ کی تیسری علمی غلطی یہ ہے کہ ہماری زبان میں اب تک اسلام پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ یا تو خالص اکیڈمک قسم کی چیزیں ہیں، یا مناظرانہ طرز کی ہیں، یا معذرت خواہانہ انداز کی ہیں، یا پھر متکلمانہ بحث و استدلال کے رنگ میں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی نسبت بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ دعوتِ دین کے مقصد کے لیے ان میں سے کوئی چیز بھی نافع نہیں ہے۔ علمی بحثیں ان لوگوں کے لیے بیشک مفید ہیں جو اسلام کے اس خاص پہلو پر بصیرت حاصل کرنا چاہتے ہوں جس پہلو سے وہ بحث متعلق ہے لیکن دعوت و تبلیغ کے لیے نہ وہ لکھی جاتی ہیں نہ اس مقصد کے لیے ان کے اندر کوئی صلاحیّت اور کشش ہوتی ہے مناظرانہ طرز کی چیزیں اولاً تو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، چند مخصوص قسم کے مسائل پر ہیں جن سے اسلام کا کوئی آئیڈیا نہیں ہوتا ہے، ثانیاً ان کے اندر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو دلوں کو اسلام سے قریب کرنے کے بجائے دور کرتی ہیں۔ معذرت خواہانہ انداز کی چیزوں سے ہمارا اشارہ ان حضرات کی مذہبی تصنیفات کی طرف ہے جو یورپ سے مرعوب تھے۔ جو چیز اہلِ یورپ کے ہاں ممدوح قرار پا گئی، ان حضرات نے کوشش کی کہ اس کا وجود اسلام میں بھی ثابت کر دیں، اگرچہ اسلام اس سے ہزاروں کوس دُور رہو۔ اسی طرح جو چیز ان کے ہاں مردود قرار دے دی گئی اس کے انکار کے دلائل ان حضرات نے بھی جمع کرنے شروع کر دیئے۔ اگرچہ وہ چیز اسلام کے ارکان و

اصول میں داخل ہو۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کمزور اور منفعل ذہنیت کے لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے نہ تو وہ اسلام کی صحیح ترجمانی ہے اور نہ اس کے اندر وہ داعیانہ اذعان و یقین ہے جو دلوں کو کھینچتا اور دماغوں کو اپیل کرتا ہے۔ متکلمانہ طرز پر جو چیزیں لکھی گئی ہیں وہ ان سب سے زیادہ مایوس کن ہیں۔ متکلمین کا طرزِ استدلال عقل و فطرت سے بعید تر ہے۔ اس سے کسی مسئلہ کی گرہوں میں اضافہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن کسی گرہ کو کھولا نہیں جا سکتا۔ یہ طرزِ استدلال صرف کج بحثیوں کے لیے موزوں ہے اس کے اندر نہ تو دل نشینی ہے نہ کشش ہے، نہ یہ عقلِ سلیم اور فطرتِ انسانی سے کوئی موافقت رکھتا ہے۔ اس کو اسلام کے پیش کرنے کا ذریعہ بنانا لوگوں کو اسلام سے متنفر اور بدگمان کرنا ہے۔ اسلام کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا واحد طریقہ وہی تھا جو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول نے اختیار کیا۔ لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے فلسفے سے اس قدر مرعوب ہوئے کہ انھوں نے قرآن کے طرزِ استدلال کی طرف نہ صرف یہ کہ سرے سے کوئی توجہ نہیں کی بلکہ اُلٹا اس کو مطعون کیا اور حقیر ٹھیرایا۔ یہ غلطی ہمارے پرانے متکلمین نے بھی کی اور اسی غلطی کے مرتکب ہمارے نئے متکلمین ہوئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں پر اسلام کی حجت تمام کرنا تو الگ رہا خود پڑھے لکھے وہ مسلمان بھی جو مسلمان باقی رہنا چاہتے ہیں یا کم از کم اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانا چاہتے ہیں، یہ کہنے لگے کہ اسلام بس دل سے مان لینے کی چیز ہے، عقل سے سمجھنے کی چیز نہیں ہے، اور جو جری اور بیباک ہیں انھوں نے علانیہ اسلام کا مذاق اُڑانا شروع کر دیا اور نام کے سوا ہر چیز میں وہ اسلام سے بالکل آزاد ہو گئے۔

مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی عملی غلطیاں

مروّجہ طریقۂ تبلیغ میں عملی پہلو سے بھی کچھ کم غلطیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے بھی بعض کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی غلطی پہلی عملی غلطی مسلمانوں کی تشتر گربگی ہے۔ تشتر گربگی سے مطلب یہ ہے کہ ایک طرف

تو یہ ایک اصولی جماعت ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں جس کی تعمیر اسلام اور ایمان کے اصولوں پر ہوئی ہے، لیکن دوسری طرف یہ اس طرح کی تمام خصوصیات بھی رکھتے ہیں جس طرح کی خصوصیات ایک قوم میں پائی ہیں، جو نسل ونسب یا وطن کے اشتراک یا تہذیب و معاشرت کی یکسانی سے بن جایا کرتی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہتے کہ مسلمان وہ ہے جو اللہ پر، اس کے رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، یوم آخرت پر ایمان لائے اور معیشت و معاشرت اور اخلاق وعمل کے سارے گوشوں میں اللہ اور اس کے رسولوں کے بتائے ہوئے طریقوں کا پابند ہو، دوسری طرف بے شمار ایسے انسان بھی ان کے اندر شامل ہیں جو بجز اس کے کہ کسی مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں اور کسی طرح کا بھی اشتراک ان کے ساتھ نہیں رکھتے۔ ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے ہادی اور رہنما محمد رسول اللہؐ ہیں۔ دوسری طرف انھوں نے اپنی قیادت کی باگیں ان لوگوں کے سپرد کر رکھی ہیں جو علم وعمل دونوں میں رسول اللہؐ کی ہدایات سے بے نیاز ہیں۔ ایک طرف تو یہ اخلاق وعمل کا ایک پورا نظام پیش کرتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں کہ ان سے منحرف ہو کر کوئی شخص مسلمان نہیں باقی رہ سکتا، دوسری طرف بداخلاقی اور بدعملی کی جتنی قسمیں دوسری قوموں کے اندر پائی جاتی ہیں ان سب کے نمونے وہ خود پیش کرتے ہیں، اور اس سے ان کی اسلامیت میں کوئی خرابی نہیں پیدا ہوتی۔ ایک طرف تو یہ اپنی ساری وابستگی ایک نظام حق کے ساتھ دکھاتے ہیں اور مدعی ہیں کہ اس سے سرمو انحراف جائز نہیں ہے، لیکن دوسری طرف آنحضرتؐ سے لے کر مصطفےٰ کمال تک کی پوری تاریخ کو اسلامی تاریخ بتاتے ہیں، جس کا ایک بڑا حصہ اسلام کے نظام حق سے کوئی ادنیٰ مناسبت بھی نہیں رکھتا۔ ایک طرف تو یہ مدعی ہیں کہ اسلام خود ایک مکمل نظام زندگی ہے اور آج اگر دنیا کی نجات کسی چیز میں ہے تو بس اس نظام کو اختیار کر لینے میں ہے۔ لیکن دوسری طرف حال یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کا طواف کرتے پھر رہے ہیں کہ معلوم کریں کہ انگریزوں کا نظام زیادہ اسلامی ہے یا امریکیوں کا ہے۔

اپنی یہ دورنگی چاہے مسلمان خود نہ محسوس کرتے ہوں لیکن دوسری قومیں، کوئی وجہ نہیں

ہے کہ ان کی اس عجیب و غریب پوزیشن پر قہقہہ نہ لگائیں۔ وہ لازمی طور پر مسلمانوں کے قول وعمل کے اس تضاد کو دیکھ کر حیران ہوتی ہیں، اور ان میں سے اگر کسی خدا کے بندے کو اللہ کی توفیق سے اسلام کی طرف کشش ہوتی بھی ہے تو یہ دیکھ کر رُک جاتا ہے کہ مسلمان تو اسی طرح کی ایک قوم ہے جس طرح کی قوم خود اس کی اپنی ہے۔ پھر ایک قوم کو چھوڑ کر بالکل اسی طرح کی قوم میں داخل ہونے کے کیا معنیٰ! ہماری اس دورنگی کے باوجود اگر کوئی نیک دل غیر مسلم اسلام لاتا ہے تو یقین کرنا چاہیئے کہ وہ ہماری دعوت کی وجہ سے اسلام نہیں لاتا ہے بلکہ اللہ تعالےٰ اس پر اس کے دین کی غلطی کے ساتھ مسلمانوں کا غلط ہونا بھی واضح کر دیتا ہے اور وہ اسلام کو مسلمانوں سے بالکل الگ کر کے دیکھتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسے پاک نفوس دنیا میں بہت کم ہیں۔ ورنہ وہ قوم دنیا میں اسلام کی اشاعت کیا کر سکتی ہے جس کے بے اصولے پن کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ایک بزرگ اشاعتِ علمِ دین کے لیے ایک ادارہ قائم کرتے ہیں، اس مقصد کے لیے مسلمانوں سے روپیہ وصول کر کے سود پر چلاتے ہیں، خود ایک ہندو یا عیسائی تبلیغی کالج میں نوکر ہیں اور اپنے صاحبزادے کو کسی آریہ یا مشن کالج میں تعلیم دلا رہے ہیں[۱]۔

دوسری غلطی دوسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی شاید مسیحی مشنریوں کی دیکھا دیکھی ہمیشہ تبلیغ کے لیے پست حال طبقوں ہی پر نظر رکھی، حالانکہ یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ تبلیغ میں اول خطاب اُن طبقات سے ہونا چاہیے جن کے افکار و نظریات کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہے۔ یہی لوگ دراصل کسی قوم کو بناتے یا بگاڑتے ہیں۔ اگر یہ راہِ راست پر آجائیں تو سارا نظام آپ سے آپ راہِ راست پر آجاتا ہے اور اگر یہ بگڑے ہوئے رہیں تو اولاً تو نیچے کے

---

[۱] جس وقت یہ مضمون لکھا گیا تھا اس وقت پیشِ نظر مشرقی پنجاب کے ایک خاص بزرگ تھے اب ع
آں قدح بشکست وآں ساقی نماند۔ خیال ہوا کہ اب اس حصہ کو حذف کر دیا جائے، لیکن چونکہ مسلمانوں کی عام حالت یہی ہے اس وجہ سے اس کو رہنے دیا گیا، البتہ اس کو ایک خاص تلمیح کے بجائے ایک عام تمثیل سمجھئے۔

طبقات میں کوئی اصلاح واقع نہیں ہوتی اور اگر واقع ہوتی بھی ہے تو وہ بالکل عارضی ہوتی ہے۔ ان کا منفعل مزاج بہت جلد ان خرابیوں کو پھر قبول کر لیتا ہے۔ جن کا دباؤ اوپر کے مؤثر اور عامل کی طرف سے پڑتا ہے۔ اس کی مثال بالکل قلب اور اعضاء وجوارح کی ہے۔ اگر قلب کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم خود بخود تندرست ہو جاتا ہے، اور اگر دل میں بیماری موجود رہے تو اعضاء وجوارح پر روغن کی مالش اور ضماد سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ عیسائی مشنریوں کے سامنے صرف اپنی تعداد بڑھانے کا سوال تھا، اس وجہ سے ان کے لیے تو یہ تدبیر مفید ہو سکتی تھی، لیکن مسلمانو کے لیے صرف اضافہ تعداد کے خیال سے تبلیغ کرنا ناجائز ہے۔ ان کو تو اللہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانا اور ان کی پوری زندگیوں کو سنوارنا ہے۔ اس طرح کا سنوارنا اسی وقت ممکن ہے۔ جب پورا ماحول سنورے، اور پورے ماحول کا سنورنا صرف اس صورت میں متوقع ہے، جب سوسائٹی کا ذہین اور کار فرما طبقہ اصلاح قبول کرنے۔ جو لوگ اجتماعیات پر تھوڑی بہت نظر رکھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ ہنگامی اور انقلابی تحریکیں تو نیچے سے چل کر اوپر کے نظام کو درہم برہم کر ڈالتی ہیں، لیکن ٹھوس اصلاحی اور عقلی دعوتیں اسی وقت جڑ پکڑا کرتی ہیں جب اوپر سے نیچے کی طرف اثر انداز ہوں۔ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے دعوت دین کا کوئی کام کیا، خواہ مسلمانوں کے اندر یا ان سے باہر، انھوں نے بالعموم یہ غلطی کی کہ اپنی نظر ہمیشہ پست حال طبقوں پر رکھی اور ان کو کلمہ پڑھا کر یا نماز سکھا کر انھوں نے سمجھا کہ بس اب ان کی اصلاح ہو گئی۔ بے شبہ اس طرح سے بعض جزئی اصلاحیں ہو جایا کرتی ہیں لیکن زندگی بحیثیت مجموعی نہ کوئی تبدیلی قبول کرتی ہے اور نہ اس طرح کوئی تبدیلی قبول کر سکتی ہے۔ جب آب وہوا بحیثیت مجموعی خراب ہو تو مریضوں کے علاج سے زیادہ اسبابِ مرض کے استیصال کی کوشش کرنی چاہیے، اور ان گندے نالوں کو بھرنا چاہیے جو جراثیم کو پھیلاتے اور ہوا کو خراب کر رہے ہیں۔ اس کے بغیر جو اصلاح ہو گی اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ رہے تو ایک شخص ایسے مقام پر جہاں طاعون یا ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی ہے لیکن اس کو ٹیکہ لگا دیا جائے۔ یہ ٹیکہ عارضی طور پر ممکن ہے مفسد اثرات کا مقابلہ کر لے، لیکن

تابکے! یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام نے، جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے معلوم ہوگا، کبھی عام لوگوں کو پہلے خطاب نہیں فرمایا، بلکہ سوسائٹی کے کارفرما عناصر کی ذہنیتوں کو تبدیل کرنے کی کوشش فرمائی، اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بنایا۔

تیسری غلطی

تیسری عملی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے تبلیغ کا ذریعہ صرف الفاظ کو بنایا، حقیقی اسلامی زندگی کا عملی مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ مجرّد اسلام کے اصولوں کی خوبی کی وجہ سے تو صرف تھوڑے سے ذہین اور غیر معمولی اخلاقی جرأت رکھنے والے لوگ ہی ایمان لا سکتے ہیں، دنیا کا بڑا حصّہ تو اسی وقت ان اصولوں کی سچّائی کا اقرار کرے گا جب عملی زندگی کے اندر ان کو اُبھرتا اور اچھے نتائج پیدا کرتا ہوا دیکھے گا۔ لیکن ہمارے یہاں عرصہ سے تبلیغِ اسلام کے سلسلہ میں جو جدوجہد کی گئی ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ خوش بیان واعظوں، پُرجوش مبلّغوں اور انشاءپرداز مصنّفوں نے دنیا کو اسلامی زندگی کی خیالی فردوس کی سیر کرائی ہے اور لطف یہ کہ ایک طرف یہ حضرات اسلام کی تمدّنی و اجتماعی برکات کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے رہے ہیں، اور دوسری طرف پوری اسلامی سوسائٹی، اپنے اندر تمام مفاسد جاہلیت کو لیے ہوئے، ان کے دعاوی کی تکذیب کرتی رہی ہے، اور چونکہ عمل کی خاموش زبان دعوے کی ناطق زبان سے زیادہ مؤثر ہے اس وجہ سے یہ سارے وعظ فضا میں گم ہو گئے، اور دنیا ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اگر مجرّد لفاظی چھوڑ کر خدا کے کچھ بندوں نے اس بات کی کوشش کی ہوتی کہ جن اُصولوں پر وہ ایمان لائے ہیں ان ہی اصولوں پر ایک سوسائٹی تعمیر کریں تو اس کوشش میں ناکام ہو کر بھی وہ دعوتِ اسلام کی اس سے بدرجہا شاندار خدمت انجام دے سکتے جو اپنے وعظوں اور لیکچروں میں کامیاب ہو کر بھی وہ انجام نہ دے سکے۔ اسلام کو ساری دنیا کے لیے خیر و برکت ثابت کرنے کے لیے نہ تنہا یہ چیز کافی ہو سکتی ہے کہ عہدِ ماضی کے کچھ اثر انگیز واقعات لوگوں کو سُنا دیئے جائیں اور نہ ہی یہ بات کچھ مفید ہے کہ اس کے عقلی امکانات پر مضامین لکھے جائیں، اور تقریریں کی جائیں۔ اس کا واحد طریقہ صرف یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں پر ایمان لانے والی

جماعت اجتماعی صورت میں ان اصولوں کا مظاہرہ کرے۔ افسوس ہے کہ سب کچھ ہوا مگر یہی بات نہیں ہوئی۔

چوتھی غلطی چوتھی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے بھی تبلیغِ دین کے لیے اسی طرح کے بعض اوچھے طریقے اختیار کیے جس طرح کے اوچھے طریقے عیسائی مشنری یا آریے استعمال کرتے رہے ہیں۔ عیسائیوں نے دُنیا کے گرے ہوئے طبقات کو جن لالچوں اور ہتھکنڈوں سے عیسائی بنایا ان ہی طریقوں کو مسلمانوں نے اپنانا چاہا۔ جو ہتھکنڈے اپنے مقصد کے لیے آریے استعمال کرتے رہتے ہیں، مسلمان بھی بے تکلّف ان کے استعمال کرنے پر اُتر آئے۔ مناظروں میں جو زبان درازیاں، جو کج بحثیاں اور جو دھینگا مشتیاں دوسروں نے کیں مسلمانوں نے بھی ان میں کسی سے پیچھے نہیں رہنا چاہا۔ مسلمانوں میں سے کوئی شخص کسی لالچ میں آکر یا کسی غلط فہمی میں پڑکر آریہ ہوگیا تو آریوں نے اپنی فتح کا ڈنکا بجایا۔ اسی طرح اگر کسی ہندو نے کہیں اسلام کا اظہار کر دیا تو مسلمانوں نے اس کو آسمان پر چڑھانے کی کوشش کی۔ نادان بچّوں کا بہکانا اور بھگالے جانا جس طرح دوسروں کے یہاں اشاعتِ دین کے پروگرام کا ایک اہم جز و تھا۔ اسی طرح مسلمان بھی ان چیزوں کو جائز سمجھنے لگ گئے۔ اگر نفس کے ہیجان کی وجہ سے کوئی ہندو عورت کسی بے قید مسلمان کے ساتھ بھاگ کھڑی ہوئی تو اس کو ایک عظیم الشان تبلیغی فتح سمجھا گیا اور اس طرح کی بے حیائی اور آوارگی بھی نصرتِ دین میں داخل ہوگئی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی بداخلاق عورتوں اور بہت سے آوارہ منش مردوں نے تبدیلِ دین کو ایک پیشہ بنالیا۔ صبح کو وہ اسلام کا اعلان کر کے مسلمانوں کے کندھوں پر سوار ہوتے اور شام کو اپنے آریہ یا عیسائی ہونے کا اعلان کر کے آریوں یا عیسائیوں سے روپے اینٹھتے۔ جس زمانہ میں ہندوستان کے بعض علاقوں میں شُدھی سنگٹھن کا زور تھا ایک بزرگ نے دلّی کی "مسلمان رنڈیوں" سے بھی اپیل کی تھی کہ وہ اپنے غیر مسلم آشناؤں پر تبلیغِ اسلام کیا کریں۔ ان حرکتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں کی نظر میں اسلام بالکل بے وقعت ہو کے رہ گیا۔ وہ یہ سمجھنے لگ گئے کہ یہ بھی دنیا کا ایک کاروبار

اور محض اپنی قوم کی تعداد بڑھانے کا ایک ذریعہ ہے جس کو عوام فریبی کے لیے مسلمان اللہ کے دین کے نام سے پیش کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ کیونکہ جس مقصد سے اور جن طریقوں سے وہ اپنے دین کو استعمال کر رہے تھے جب اسی مقصد اور ان ہی طریقوں سے بالکل حرف بحرف مسلمانوں نے بھی اسلام کو استعمال کیا تو آخر ان کے دلوں پر اسلام کی برتری کا سکہ کیسے بیٹھتا!۔

پانچویں غلطی

پانچویں عملی غلطی یہ ہے کہ اس زمانہ میں چاہے کسی اور کام کے لیے مسلمان کسی قابلیت کی ضرورت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں مگر دو کاموں کے لیے وہ سرے سے کسی قابلیت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایک امامتِ مسجد، دوسرا تبلیغِ دین۔ ایک وہ زمانہ تھا جب نماز کی امامت یا تو امیرِ اسلام کرتا تھا یا وہ شخص جس کو امیرِ اسلام اس کام پر مقرر کرے، یا اب یہ زمانہ ہے کہ جو شخص دنیا کا کوئی اور کام انجام دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے مسلمان اس کو اپنی مسجدوں کی امامت کے لیے ڈھونڈھتے ہیں۔ ایک مبارک زمانہ وہ تھا جب ہر مسلمان یہ سمجھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو برپا ہی اس لیے کیا ہے کہ خدا کے رسول ؐ نے دینِ حق جس احساسِ ذمہ داری، جس سرگرمی اور جس دل سوزی کے ساتھ ان کو پہنچایا ہے اسی احساسِ ذمہ داری، اسی سرگرمی اور اسی دل سوزی کے ساتھ یہ دوسروں کو پہنچائیں، اور اسلامی خلافت، اپنے تمام شعبوں اور اپنے تمام اعلیٰ سے اعلیٰ کارکنوں سمیت صرف اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی کا ایک ذریعہ تھی جو اللہ کے رسول ؐ کی طرف سے اس امت کی طرف منتقل ہوا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ پوری اسلامی سوسائٹی تو اپنے تمام ذہین اور کارفرما افراد اور طبقات کے ساتھ ایک جاہلی نظام کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ البتہ خدا کے بعض نیک بندوں کو کبھی کبھی یہ خیال بھی ہو جایا کرتا ہے کہ تبلیغِ اسلام بھی ایک نیک کام ہے اور وہ مسلمانوں سے کچھ پیسے اکٹھا کر کے چند تنخواہ دار ملازمین تبلیغِ اسلام کے لیے مقرر کر دیتے ہیں۔ ان ملازمین میں سب سے بڑی صفت جو تلاش کی جاتی ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے متعلق کچھ الٹی سیدھی معلومات رکھتے ہوں اور مناظرہ اور

تقریر کر سکتے ہوں۔ یہی لوگ کچھ تقریر اور مناظرہ کی مشق بہم پہنچا کر اور کچھ ادھر اُدھر سے اسلام اور دوسرے مذاہب کے متعلق بے ربط معلومات فراہم کر کے کسی انجمن کی طرف سے تبلیغ اسلام شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ نہ اسلام سے واقف ہوتے، نہ دوسرے مذاہب کی انھیں کچھ خبر ہوتی ہے اور نہ ان کے اندر اسلامی سیرت ہی کا کوئی پَرتو ہوتا۔ بس بڑے سے بڑا وصف جو ان میں ہوتا ہے وہ زبان درازی اور مناظرہ بازی ہے اور جو تبلیغِ اسلام محض زبان درازی اور مناظرہ بازی کے بل پر ہوگی اس کا نتیجہ معلوم ہے۔

مروّجہ طریقۂ تبلیغ کی بعض موٹی موٹی علمی و عملی غلطیوں کی طرف یہ ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر اس کا اچھی طرح تجزیہ کر کے اس کو دیکھا جائے تو اس کے بہت سے اور پہلو بھی قابلِ اعتراض نظر آئیں گے۔ لیکن ہم اس سے زیادہ اس بحث کو طویل نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارا مقصود ان باتوں کے ذکر کرنے سے یہ ہے کہ آج جس چیز کو ہم تبلیغ کہتے ہیں اُس تبلیغ کو اس تبلیغ سے کوئی دُور کی نسبت بھی نہیں ہے جو تبلیغ انبیائے کرامؑ نے کی ہے۔ نہ اس تبلیغ کا مقصد ہی وہ ہے جو انبیائے کرامؑ نے اپنے سامنے رکھا تھا اور نہ اس کا طریقۂ کار ہی وہ ہے جو انھوں نے اختیار فرمایا تھا۔ اس کے مقصد اور طریقۂ کار دونوں چیزوں میں دوسری غیر مسلم جماعتوں کی نقالی سرایت کر گئی ہے۔ اس وجہ سے ہم تفصیل کے ساتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرات انبیائے کرامؑ نے کس مقصد کے لیے تبلیغ کی ہے۔ کس طرح تبلیغ کی ہے؟ اس کے لیے کیا کیا وسائل و ذرائع اور کیا کیا طریقے اختیار فرمائے ہیں؟ ان کی اس تبلیغ و دعوت کی راہ میں کیا کیا مرحلے پیش آئے اور ہر ہر مرحلہ کے تقاضوں اور اس کی ذمہ داریوں کو انھوں نے کس طرح پورا کیا اور ان کی اس جدوجہد سے دنیا میں کیا کیا برکتیں ظہور میں آئیں ہیں۔

تبلیغ کس لیے؟

انبیاء کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت کے اندر نیکی اور بدی کے پہچاننے کی قابلیت اور نیکی کے اختیار کرنے اور بدی سے بچنے کی خواہش ودیعت کر دی ہے۔ اس پہلو سے انسان ایک اعلیٰ خلقت اور ایک بلند فطرت لے کر دنیا میں آیا ہے اور اس بات کا اہل ہے کہ اپنی سمجھ سے نیکی کو پسند اور بدی کو ناپسند کر کے اللہ تعالیٰ کے یہاں انعام کا مستحق ہو اور اگر اپنی فطرت کے خلاف خیر کی جگہ شر کا راستہ اختیار کرے تو فاطر کی طرف سے اپنی اس خلافِ فطرت روش پر سزا پائے۔ لیکن اگر ایک طرف اس کی فطرت میں یہ پہلو خوبی اور کمال کا ہے تو دوسری طرف بعض اعتبارات سے اس میں خلا[۱] اور نقص بھی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے نہ دنیا میں انسان کی ہدایت و ضلالت کے معاملہ کو تنہا اس کی فطرت پر چھوڑا نہ آخرت میں اس کو جزاء و سزا دینے کے لیے اس فطری رہنمائی کو کافی قرار دیا، بلکہ فطرت کے مقتضیات اور اس کی مخفی قابلیتوں کو آشکارا کرنے اور خلق پر اپنی حجت تمام کرنے کے لیے اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجا، تاکہ قیامت کے دن لوگ یہ عذر نہ کر سکیں کہ ان کو نیکی اور سچائی کا راستہ

---

[۱] انسانی فطرت کے اندر جو خلا چھوڑا گیا ہے اور جس کی وجہ سے انسان انبیاء کی رہنمائی کا محتاج ہوا اس پر مفصل بحث کے لیے موزوں جگہ ہماری کتاب ”حقیقت رسالت“ ہے جو ابھی شائع نہیں ہو سکی ہے۔ یہاں اس مسئلہ پر بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔

معلوم نہیں تھا، اس وجہ سے وہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہے، اس حقیقت کو قرآن مجید کی ان آیتوں میں واضح کیا گیا ہے:۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔

(۱۶۵۔ نساء)

اور ہم نے بھیجے اپنے رسول خوشخبری دیتے ہوئے اور ہوشیار کرتے ہوئے تاکہ لوگوں کے پاس ان رسولوں کے بعد اللہ کے خلاف کوئی دلیل نہ باقی رہ جائے اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلٰى فَتْرَةٍ مِّنَ الرُّسُلِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْ بَشِيْرٍ وَّلَا نَذِيْرٍ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَشِيْرٌ وَّنَذِيْرٌ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

اے اہل کتاب، انبیاء کے ایک وقفہ کے بعد ہمارا رسول تمہارے پاس دین حق کو واضح کرتا ہوا آگیا ہے تاکہ تم (قیامت کے دن) یہ عذر نہ کر سکو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا (دیکھو) ایک خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

انبیاء کے باب میں قانونِ الٰہی

اس مقصد کے لیے اللہ تعالےٰ نے ہر قوم میں اپنے ہادی اور رسول بھیجے، اور محض اس لیے کہ لوگوں پر حق پوری طرح آشکارا ہو جائے، اور کجروی اور گمراہی پر باقی رہنے کے لیے لوگوں کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ انبیائے کے بارے میں قانونِ الٰہی یہ رہا ہے کہ وہ سب کے سب بلا استثنا انسانوں میں سے آئے۔ فرشتوں یا جنوں میں سے نہیں آئے تاکہ انسانوں پر انسانی فطرت کے مقتضیات انسانوں کے ذریعہ سے واضح کئے جائیں اور لوگوں کے لیے یہ کہنے کا موقع باقی نہ رہے کہ انسان کے لیے کسی غیر انسان کا علم و عمل کیسے نمونے کا کام دے سکتا ہے؟ اسی طرح بعض مستثنےٰ مثالوں کے سوا ہر قوم کے اندر، اللہ تعالےٰ نے اسی قوم کے اندر سے رسول بھیجے تاکہ قومی اجنبیت لوگوں کے لیے قبولِ حق میں مانع نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قوم کے لوگوں پر اللہ کے رسولوں نے ان ہی کی زبان میں حق کی تبلیغ کی تاکہ لوگوں پر حق اچھی طرح واضح ہو سکے اور زبان بھی ایسی صاف ستھری استعمال

کی جو اپنے ہیچ سے بالکل پاک اور سب کے فہم سے قریب تر اور دل نشین تھی۔ پھر اللہ کے ان رسولوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ لوگوں کو ایک مرتبہ حق کی طرف پکار دیا ہو بلکہ اپنی پوری زندگیاں اسی مقصد میں لگا دیں اور جن باتوں کی دعوت دی ان باتوں کو خود بھی کر کے دکھا دیا اور ان کے ساتھیوں نے بھی اپنی عملی زندگی میں ان باتوں کا مظاہرہ کیا۔ یہ سارا اہتمام محض اس غرض کے لیے کیا گیا کہ خلق کو خالق کی رضا حاصل کرنے اور دُنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ جاننا چاہیے اس کے بتانے میں کسی پہلو سے کوئی کسر رہ جائے اور لوگ قیامت کے دن اپنی شرارتوں اور بد عملیوں کا الزام اللہ سبحانہٗ تعالیٰ پر نہ ڈال سکیں۔

خاتم الانبیاء کی بعثت

جب تک دنیا نے تمدنی و اجتماعی زندگی کے وہ وسائل نہیں پیدا کر لیے جو ساری دنیا کو ایک داعیٔ حق دعوت پر جمع کرنے کے لیے ضروری تھے اس وقت تک اللہ تعالےٰ نے الگ الگ قوموں کے اندر رسولوں کا بھیجنا جاری رکھا۔ لیکن جب انبیاء کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی و اجتماعی شعور اتنا بیدار ہو گیا کہ وہ ایک عالمگیر نظامِ عدل کے تحت زندگی بسر کر سکیں اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے مادی وسائلِ اجتماع و تمدن نے بھی اس حد تک ترقی کر لی کہ ایک ہادی کا پیغام ہدایت دنیا کے ہر گوشے میں بسہولت پہنچ سکے تو اللہ تعالےٰ کی رحمت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجے اور ان کے ذریعہ سے لوگوں کو وہ مکمل نظامِ زندگی عنایت فرمائے۔ جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور ان کے حالات و ضروریات کے بالکل مطابق ہو۔ یہی خدائی نظامِ زندگی ہے جس کو ہم اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ اپنی روح و مغز کے اعتبار سے وہی دین ہے جس کو تمام انبیاء لے کر آئے۔ صرف بعض اعتبارات سے یہ ان سے مختلف ہے۔ پہلے انبیاء نے عقائد کی تعلیم اپنی قوموں کی استعداد کے لحاظ سے دی تھی۔ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد کی تعلیم اس معیارِ فہم کے لحاظ سے دی جو اللہ تعالیٰ نے بنی نوعِ انسان کو عطا فرمایا ہے دوسرے انبیاء نے جن قوانین کی تعلیم دی ان میں ان کی قوموں کے خاص

مزاج اور ان کے خاص خاص امراض کی رعایت تھی لیکن اسلام کے قوانین میں کسی خاص قومی اور جماعتی مزاج ورجحان کے لحاظ کے بجائے صرف مزاجِ انسانی کا لحاظ ہے۔ دوسرے انبیاء کو جو نظامِ زندگی خدا کی طرف سے عطا ہوا وہ صرف ان کی قوموں کی ضروریات کے اعتبار سے تھا اور آنحضرت ؐ کے ذریعہ سے جو نظامِ زندگی دنیا کو ملا وہ صرف کسی خاص قوم ہی کی ضروریات کو پورا نہیں کرتا بلکہ بنی نوعِ انسان کی تمام انفرادی واجتماعی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

آنحضرت ؐ کی بعثت کے دو پہلو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چونکہ تمام عالم کی ہدایت ورہنمائی اور تمام مخلوق پر اتمام حجت کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور آپ ؐ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالےٰ نے آپ ؐ کو دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ ایک بعثتِ خاص دوسری بعثتِ عام۔ آپ ؐ کی بعثتِ خاص اہلِ عرب کی طرف تھی اور اہلِ عرب کے ساتھ اسی خاص نسبت کی وجہ سے آپ ؐ کو "نبی امّی" یا "نبی عربی" کہا گیا اور آپ ؐ پر جو وحی نازل ہوئی اس کی زبان بھی عربی ہوئی۔ اس بعثت کی ذمہ داریاں (یعنی تبلیغ اور اتمام حجت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے براہِ راست انجام دیں۔

آپ ؐ کی بعثتِ عام تمام دنیا کی طرف ہے۔ اس بعثت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے آپ ؐ کو ایک امت عطا فرمائی، اور اس امت کو یہ حکم دیا کہ رسول ؐ نے جس دینِ حق کی تبلیغ تم پر کی ہے اس کی تبلیغ اسی طرح تم دوسروں پر کرتے رہنا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔	اور اسی طرح ہم نے بنایا تم کو وسطِ شاہراہ پر قائم رہنے والی امت تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دو اور رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے۔
وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ۔	اور میرے پاس اس قرآن کی وحی آئی ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ تم کو ہوشیار کروں اور جن کو یہ پہنچے (وہ دوسروں کو ہوشیار کریں)۔

دین کی حفاظت کے لیے دو خاص انتظام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کے مقصد کی تکمیل کے لیے ایک پوری امت کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے برپا کیا تاکہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر بولی میں یہ دعوتِ حق قیامت تک بلند ہوتی رہے، اور دنیا الگ الگ نبیوں کی بعثت اور الگ الگ زبانوں میں وحی کے اُترنے کی ضرورت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جائے۔ اور چونکہ آپؐ کے بعد اب کسی اور نبی کی بعثت ہونے والی نہیں تھی اور خلق کی رہنمائی اور اتمامِ حجّت کی پوری ذمّہ داری ہمیشہ کے لیے آپؐ کی امّت پر ڈال دی گئی تھی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کو صحیح حالت میں محفوظ رکھنے کے لیے دو خاص انتظام فرمائے۔

ایک یہ کہ قرآن مجید کو ہر قسم کی کمی بیشی اور تحریف و تبدیل سے محفوظ فرما دیا تاکہ دنیا کو اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے لیے کسی نئے نبی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ اس امّت کے اندر، جیساکہ صحیح حدیثوں میں وارد ہے، ہمیشہ کے لیے ایک گروہ کو حق پر قائم کر دیا۔ تاکہ جو لوگ فی الحقیقت حق کے طالب ہیں، ان کے لیے ان کا علم و عمل شمعِ راہ کا کام دیتا رہے۔ اس طرح کی ایک جماعت (اگرچہ اس کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو) اس امّت میں ہمیشہ باقی رہے گی۔ فتنوں کا کتنا ہی زور ہو لیکن یہ صالح جماعت[1] آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کے علم و عمل کو زندہ رکھے گی، جب ضلالت کا اثر اس امّت کے رگ و ریشہ میں اس طرح سرایت کر جائیگا جس طرح دیوانے کتّے کے کاٹے ہوئے آدمی کے رگ و ریشہ میں اس کا زہر سرایت کر جاتا ہے اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس امّت کے ایک عضو کو اس زہر سے محفوظ رکھے گا۔ جب دنیا خمیر اتنا بگڑ جائے گا کہ معروف منکر بن جائے گا اور منکر معروف بن جائے گا اور اہلِ بدعت کا اتنا زور ہوگا کہ معروف کے ان داعیوں کی حیثیت دنیا میں اجنبیوں اور بیگانوں کی ہو جائیگی اس وقت بھی

---

[1] یہاں ہمارا اشارہ لاتزال طائفۃ من امتی الحدیث اور اس مفہوم کی ان متعدد روایات کی طرف ہے جو صحاح میں وارد ہیں اور جن کی صحت پر ائمہ حدیث کا اتفاق ہے۔

یہ لوگ خلق کو معروف کی طرف پکارتے رہیں گے اور ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود لوگوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں کی اصلاح کی کوشش کریں گے۔ ہر دور میں اس طرح کی جماعت کو باقی رکھنے سے اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ جس طرح علمِ وحی کو قرآن کی صورت میں قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا ہے اسی طرح اللہ کے رسول ؐ اور رسول ؐ کے صحابہ ؓ کے علم و عمل کو اس جماعت کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا جائے اور خلق کی ہدایت اور رسول ؐ کی حجت تمام کرنے کے لیے جو روشنی مطلوب ہے وہ کبھی گُل ہونے نہ پائے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے الفاظ میں یہ لوگ پہاڑ کے چراغ ہوں گے جن سے راہ ڈھونڈھنے والے رہنمائی حاصل کریں گے اور زمین کے نمک ہوں گے جن سے کوئی چیز نمکین کی جا سکے گی۔

تبلیغ بحیثیت ایک فریضۂ رسالت کے

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شہادت علی النّاس یا تبلیغ دین محض بطور ایک نیکی اور دین داری کے مطلوب نہیں ہے اور نہ محض مسلمانوں کی تعداد بڑھانے کے لیے مطلوب ہے۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عام کا جو مقصد اس امّت کے ہاتھوں پورا ہونا ہے، یہ اس کا مطالبہ ہے جو اللہ کے ہر اس بندے کو ادا کرنا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت میں داخل ہے، یہ ایک فریضۂ رسالت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس امّت پر ڈالا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے تو وہ اس فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہی کریں گے۔ جس کا بار اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ڈالا ہے اور اس کوتاہی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خیر امّت کے اس منصب سے محروم کر دے جس پر اس فرض کی ادائیگی ہی کے لیے ان کو سرفراز فرمایا ہے، اور ساری دنیا کی گمراہی کا وبال ان کے سر آئے۔ کیونکہ آج خلق پر اتمامِ حجّت کا ذریعہ یہی ہیں۔ اگر یہ اتمامِ حجت کے فرض کو ادا نہ کریں تو دنیا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی گمراہیوں کے لیے یہ عذر کر سکتی ہے کہ تو نے جن کو شہداء علی النّاس بنایا تھا اور جن پر ہماری رہنمائی کی ذمہ داری ڈالی تھی انھوں نے ہمارے سامنے تیرے دین کی تبلیغ نہیں

کی، ورنہ ہم ان ضلالتوں میں نہ پڑتے اور مسلمان اس الزام کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

تبلیغ کے شرائط

شہادت علی النّاس یا تبلیغِ عام کی یہ ذمّہ داری صرف اتنے سے ادا نہیں ہوسکتی کہ دنیا میں مسلمان نامی ایک گروہ موجود رہے، خواہ وہ شہادت علی النّاس کا یہ فرض انجام دے یا نہ دے، اور نہ ان اُلٹی سیدھی تدبیروں ہی سے ادا ہوسکتی ہے جن پر کتاب کے شروع میں ہم تنقید کر کے بتا چکے ہیں کہ ان تدبیروں سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ حق کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا بلکہ اُلٹے ان سے شدید نقصان پہنچا۔ یہ ایک نہایت اہم فریضۂ رسالت کی ادائیگی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو ان شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے جن شرائط کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس کو انجام دینے کا حکم دیا ہے اور جن شرائط کے ساتھ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام نے اس کو انجام دیا ہے۔ یہاں ہم ان بعض ضروری شرطوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو اس فرض کی ادائیگی کے لیے ناگزیر ہیں۔

پہلی شرط

اس شہادت کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم جس دینِ حق کے شاہد ہیں پہلے صدق دل کے ساتھ اس پر خود ایمان لائیں۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام جس حق کی دعوت دیتے تھے اس پر خود ایمان لاتے تھے۔ اپنے آپ کو اس حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ وَ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ[1]۔

اس حق پر ایمان لانے کے بعد جو چیزیں اس کے خلاف ہوئیں خواہ وہ آباء و اجداد کا دین ہو، خواہ قوم و قبیلہ کی عصبیت ہو، خواہ اپنا شخصی اور جماعتی مفاد ہو، سب سے دستبردار ہونے کے لیے انھوں نے سب سے پہلے اپنے آپ کو پیش کیا، اور ان سارے خطرات میں جو اس ایمان کے سبب سے پیش آئے "اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ" اور "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" (میں پہلا مومن ہوں، میں پہلا مسلم ہوں) کہتے ہوئے انھوں نے خود چھلانگ لگائی۔ یہ نہیں

---

[1] رسولؐ ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اُتاری گئی اس کے رب کی طرف سے اور اہلِ ایمان۔

ہوا کہ خود تو اس سے کنارے رہے ہوں اور دوسروں کو اس بات کی دعوت دی ہو کہ تمہاری نجات اگر ہے تو بس اسی میں ہے کہ اس میں چھلانگ لگا دو۔

دوسری شرط دوسری شرط یہ ہے کہ آدمی جس حق پر ایمان لایا ہے اس کی زبان سے شہادت دے۔ جو شخص ایک حق پر ایمان لایا ہے اگر اس کو ظاہر کر سکنے کے باوجود ظاہر نہیں کرتا تو وہ "گونگا شیطان" ہے، اور قیامت کے دن اس پر حق کو چھپانے کا وہی جرم عائد ہوگا جو یہود پر عائد ہوا (وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ[1] الآیۃ) اس معاملہ میں مصلحت بینی جو کچھ بھی ہونی چاہیے وہ دراصل حق کی خاطر ہونی چاہیے کہ اس کا اظہار صحیح طریق پر، صحیح محل میں، صحیح مخاطب کے سامنے ہو، تاکہ دعوتِ حق کا تخم بارآور ہو۔ اگر آدمی حق کو بالکل نظر انداز کر کے مجرّد اپنے ذاتی مفاد کے پیشِ نظر ایک امرِ حق کے اظہار سے جی چراتا ہے یا اس سے غفلت برتتا ہے تو صرف بعض مستثنٰی حالات ہی میں اس کی اجازت ہے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کی جان کے لیے کوئی واقعی خطرہ ہو اور وہ اس امر کو محسوس کرتا ہو کہ اس وقت حق کی خدمت کے نقطۂ نظر سے بھی زیادہ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان بچا لے جائے۔ اس طرح کے کسی واقعی خطرہ کے بغیر اگر کوئی شخص اظہارِ حق سے جی چُراتا ہے تو یا تو وہ منافق ہے یا کم از کم بے غیرت اور بے حمیّت۔

تیسری شرط تیسری شرط یہ ہے کہ یہ شہادت عمل سے بھی دی جائے، صرف قول ہی سے نہ دی جائے۔ اسلام میں وہ شہادت معتبر نہیں ہے جس کے ساتھ عمل کی تائید و توثیق موجود نہ ہو۔ بعض لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے اور آپ کے سامنے بسا اوقات قسمیں کھا کھا کر کہتے کہ ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن اللہ تعالےٰ نے ان

---

[1] اور یاد کرو جب اللہ نے اہلِ کتاب سے عہد لیا کہ تم کتاب الٰہی کو پوری وضاحت کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرو گے اور اس کو چھپاؤ گے نہیں۔

کی شہادت کو تسلیم نہیں کیا اور فرمایا کہ یہ لوگ منافق اور جھوٹے ہیں، اور اس کے ثبوت میں ان کے ان اعمال و اقوال کو ان کے سامنے رکھ دیا جن سے صاف اسلام اور مسلمانوں کی بدخواہی اور حق دشمنی نمایاں تھی۔ جو شخص ایک امر کو حق مانتا ہے اور لوگوں کو اس کی دعوت بھی دیتا ہے، اس کے لیے لازمی ہے کہ اس کا عمل بھی اس کے موافق ہو، ورنہ وہ ان علمائے یہود کے نقش قدم کا پیرو ہے جن کو قرآن نے ملامت کی ہے کہ تم دوسروں کو تو خدا کے ساتھ وفاداری کی دعوت دیتے ہو لیکن خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہو۔ جس آدمی یا جس گروہ کا رویّہ اس کی دعوت کے خلاف ہے وہ در حقیقت اپنی دعوت کی تردید کے دلائل خود پیش کرتا ہے اور عمل کی دلیل چونکہ قول کی دلیل سے زیادہ قوی ہے اس وجہ سے خود اس کا رویّہ اس کے دعوے کے خلاف ایسی حجت ہے کہ اس کے بعد اس کی تردید کے لیے کسی اور حجّت کی ضرورت باقی نہیں رہتی مسلمان اگر اللہ کے دین کے شاہد ہیں تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس پر ایمان بھی لائیں، اس کی دعوت بھی دیں، اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر عمل بھی کریں۔ ورنہ اس شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جس پر اللہ تعالےٰ نے ان کو مامور کیا ہے۔ زندگی کے عملی معاملات میں اس دین سے منحرف رہنا اور زبان سے اس کے حق ہونے کی شہادت دینا خلق کے اوپر اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے ایک بالکل لغو حرکت ہے۔ ایسے بے حس واعظوں کے وعظوں کی بنا پر اللہ تعالےٰ اگر اپنی مخلوق کو مجرم ٹھہرائے تو اس سے بڑا ظلم کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ البتہ اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ خود مسلمانوں پر اس دین کی حجت پوری طرح تمام ہو جائے گی اور قیامت کے دن وہ اپنے ہی اقراروں پر پکڑے جائیں گے۔ عملی معاملات میں دین سے انحراف کی جو شکلیں جائز ہیں ان کو قرآن نے خود بیان کر دیا ہے، اور ساتھ ہی ان کا علاج بھی بتا دیا ہے اس کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جذبات یا شہوات کے غلبہ سے آدمی کا کوئی قدم حق کے خلاف اُٹھ جائے اس کا علاج یہ ہے کہ آدمی فوراً توبہ کرلے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی حق سے انحراف پر مجبور کر دیا جائے۔ اس کی تلافی کی تدبیر

یہ ہے کہ آدمی اس چیز سے نکلنے کے لیے جد و جہد کرے۔ اگر توبہ اور اصلاح کی جد و جہد کے بجائے آدمی اپنی غلطی ہی اوڑھنا بچھونا بنالے اور جس حالتِ اضطرار میں گرفتار ہو گیا ہے اسی کو دین و مذہب قرار دے بیٹھے تو شہادت علی الناس کے جس منصب پر وہ مامور کیا گیا تھا باطل پر اس کی اس قناعت نے اس سے اسے خود بخود ہٹا دیا۔

چوتھی شرط

چوتھی شرط یہ ہے کہ شہادت ہر قسم کی قومی و گروہی عصبیت سے بالاتر ہو کر دی جائے۔ نہ کسی قوم کی دشمنی ہمیں اس حق سے منحرف کر سکے جس کے ہم داعی ہیں اور نہ کسی قوم کی حمایت و حمیّت کا جذبہ اس سے ہمیں منحرف کر سکے۔ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں ہمیں جس طرح بے لاگ ہونا چاہیے اس کی تعلیم قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ	اے ایمان والو! اللہ کے لیے حق کی شہادت
لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ	دینے والے بنو اور کسی قوم کی مخالفت تمہیں
شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا	اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف
(الآیۃ)	سے ہٹ جاؤ۔

اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کے مقابل میں جس طرح بے لوث ہونا چاہیے اس کی تعلیم اس طرح دی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو! حق کے برپا کرنے
قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ	والے بنو، اللہ کے لیے گواہی دیتے ہوئے
وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ	اگرچہ یہ تمہارے اور تمہارے والدین
وَالْأَقْرَبِينَ ۔ (الآیۃ)	اور اقرباء کے خلاف ہی کیوں نہ پڑے۔

پانچویں شرط

پانچویں شرط یہ ہے کہ اس پورے حق کی شہادت دی جائے جو خدا کی طرف سے اُترا ہے۔ کسی ملامت یا مخالفت کے اندیشہ سے اس میں سے کوئی چیز کم نہ کی جائے، جن چیزوں کی شہادت انفرادی زندگی کے فرائض میں

ہے ان کی شہادت افراد اپنی انفرادی زندگیوں میں دیں۔ نماز ہر شخص پڑھے، روزہ ہر شخص رکھے، زکوٰۃ ہر صاحب مال دے، حج ہر صاحب استطاعت کرے، نیکی، دیانت داری، راستبازی اور پاکبازی کی زندگی ہر مسلمان اختیار کرے، البتہ جن چیزوں کی شہادت کے لیے اجتماعی زندگی شرط ہے اس کے لیے افراد کا فرض ہے کہ جماعتی زندگی پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کریں، اور جب وہ وجود میں آجائے تو اس کی شہادت دیں۔ مثلاً معاشرت و معیشت کا اجتماعی نظام اور ملک کا سیاسی نظم و نسق افراد کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے ایک جماعت کی قوت درکار ہے۔ اس وجہ سے اس سلسلہ میں سب سے مقدم ضرورت ایک صالح جماعت کے قیام کی ہے۔ اس جماعت کے قیام کے بعد اجتماعی زندگی کے ہر گوشے میں بھی اس حق کی شہادت واجب ہو جائے گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُترا ہے۔ ذیل میں ہم چند آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ کس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے دین کی بغیر کسی کمی بیشی کے دعوت کی تاکید کی گئی ہے:۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ (۶۷ : مائدہ)	اے رسول جو (حق) تم پر تمہارے رب کی جانب سے اُتارا گیا ہے اس (پورے حق) کی تبلیغ کرو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرض رسالت کو ادا نہیں کیا اور مخالفوں کی پروا نہ کرو) اللہ لوگوں کے شر سے تمہاری حفاظت کرے گا۔
الَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَالَاتِ اللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا اللَّهَ ۗ (احزاب ۳۹)	جو اللہ کے حکموں کو پہنچاتے ہیں اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ڈرتے۔
وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ	اور کافروں اور منافقوں کی بات پر دھیان

وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (احزاب، ۴۸)

نہ کر، ان کی ایذارسانیوں سے درگزر کر اور اللہ پر بھروسہ کر۔

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ۔ (الشوریٰ، ۱۵)

پس اسی راہ کی دعوت دے اور اسی پر جما رہ، اور ان کی بدعتوں کی پیروی نہ کر اور کہہ دے کہ اللہ نے جو کتاب اُتاری ہے میں اس پر ایمان لایا ہوں۔

چھٹی شرط چھٹی شرط یہ ہے کہ جب ضرورت داعی ہو اللہ کے دین کی شہادت جان دیکر کر دی جائے۔ یہ شہادت کا سب سے اونچا مرتبہ ہے۔ اسی وجہ سے ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کے دین کو برپا کرنے کے لیے جہاد کیا اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کے حق ہونے کی گواہی تلواروں کے سایہ میں بھی دی، ان کو شہید کہا گیا ہے۔ اور غور کیجیے تو ان لوگوں کے سوا نہ اس لقب کا کوئی اور مستحق ہو سکتا ہے، اور نہ اس لقب کے سوا کوئی اور لقب ان کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ اس امّت پر شہادت علی النّاس کی جو ذمہ داری اللہ تعالےٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کو پورا کرنے والے ہزاروں لاکھوں ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی محنت کا اللہ کے ہاں اجر بھی پائے گا۔ لیکن جنہوں نے اس راہ میں اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیا اور اپنے سر دے کر اس حق کی گواہی دی درحقیقت وہی اس بات کے اہل ہیں کہ ان کو شہید کا لقب ملے کیونکہ ایک چیز کے حق ہونے کی اس سے بڑی شہادت کوئی اور نہیں ہو سکتی کہ آدمی اس کی حمایت و نصرت کی راہ میں اپنا سر کٹا دے۔ پس جو ہمت ور یہ بازی کھیل گیا اس نے وہ شہادت دے دی جس کے بعد شہادت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہتا۔

مسلمانوں کا فرضِ منصبی یہی فریضۂ رسالت ہے جس کی وجہ سے اس امّت کو "خیر امت" کہا گیا ہے۔ اگر مسلمان اس فرضِ منصبی کو بھلا دیں تو یہ دنیا

کی قوموں میں سے بس ایک قوم ہیں، نہ ان کے اندر کوئی خاص خوبی ہے، نہ کوئی خاص وجہِ فضیلت، اور نہ پھر اللہ تعالےٰ کو اس بات کی پروا ہے کہ وہ دنیا میں عزّت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں یا ذلّت کے ساتھ، بلکہ اس فرض کو فراموش کر دینے کے بعد وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ایک معتوب قوم بن جائیں گے جس طرح دنیا کی دوسری قومیں، جو خدا کی طرف سے کسی منصب پر سرفراز کی گئی تھیں، اپنا فرض انجام نہ دینے کی وجہ سے معتوب ہو گئیں۔ چنانچہ جس آیت میں مسلمانوں کے "خیرِ امّت" ہونے کا ذکر ہے اسی میں ان کی ذمّہ داری بھی واضح کر دی گئی ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	تم بہترین امّت ہو جو لوگوں کے لیے
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	برپا کئے گئے ہو، نیکی کا حکم دیتے ہوئے
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ	برائی سے روکتے ہوئے اور اللہ پر ایمان
بِاللَّهِ ۗ (۱۱۰۔ آلِ عمران)	لاتے ہوئے۔

اس جماعتی فرض کو ادا کرنے کی باضابطہ صورت خود اللہ تعالےٰ کی بتائی ہوئی یہ ہے:

وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ	اور چاہیئے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو
إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، معروف
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ۚ وَأُولَٰئِكَ	کا حکم دے اور منکر سے روکے اور یہی
هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔ (۱۰۴، آلِ عمران)	لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوّت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ نیکی کی دعوت، معروف کا حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا، جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعتی فرض کو انجام دے سکیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، اس امّت

کو حق پر استوار رکھنے اور دنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس امّت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور مسلمانوں سے باہر بھی انجام دیتا رہا ہر مسلمان اُس فرض سے سبکدوش رہا جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے عائد کیا گیا تھا۔ اس وقت تک تبلیغ کا فرض ایک فرضِ کفایہ تھا، اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو اس فرض کی ذمہ داری سے عنداللہ بری کر دیتا تھا۔ لیکن جب یہ نظام درہم برہم ہوگیا تو جس طرح کسی ملک کا سیاسی نظام درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے باشندوں کے جان و مال کی ذمّہ داری خود ان کے اوپر منتقل ہو جاتی ہے اور جب تک وہ از سرِ نو اپنے نظامِ سیاسی کو درست نہ کرلیں ان میں سے ہر شخص اپنی حفاظت کا بوجھ خود اٹھاتا ہے، اسی طرح نظامِ خلافت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اب یہ فریضۂ شہادت علی النّاس اس امّت کے تمام افراد پر منتقل ہوگیا ہے، اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس صالح اسلامی نظام کو قائم نہ کر دیں جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمّہ ہے اور قیامت کے دن اس کی پرسش ہر شخص سے ہوگی۔

اس پوری تفصیل کا خلاصہ یہ ہے:

خلاصۂ بحث

الف: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں قیامت تک کے لیے تبلیغِ دین کی جو ذمّہ داری ڈالی گئی تھی اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ تعالےٰ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امّت کے سپرد فرمایا۔ تاکہ یہ امّت، ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

ب: اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالےٰ کی طرف سے یہ شرط مقرر ہے کہ یہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے، بلا تقسیم و تفریق، پورے دین کی کی جائے۔ بے خوفِ لومۃ لائم اور بے رو رعایت کی جائے اور ضرورت داعی ہو تو جان دیکر

کی جائے۔

ج : اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا، اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا ہر مسلمان اس فرض کی ذمّہ داریوں سے سبکدوش تھا۔

د : اس ادارہ کے منتشر ہوجانے کے بعد اس فرض کی ذمّہ داری امّت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہوگئی۔

ہ : اب اس فرض کی مسئولیّت اور ذمّہ داری سے سبکدوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں۔ یا تو اس ادارہ کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

و : اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات نہ کریں تو وہ اس فرض رسالت کو ادا نہ کرنے کے مجرم ہوں گے جو اللہ تعالےٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہ لیں گے، بلکہ خلق کی گمراہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کے لیے اصل محرّک درحقیقت اس فرضِ عظیم کا احساس ہے جو مسلمانوں پر اللہ تعالےٰ کی طرف سے ڈالا گیا ہے اور اس میں جو چیز بطورِ مطمحِ نظر اس وقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے وہ یہ ہے کہ وہ نظامِ دعوتِ خیر پھر وجود میں آجائے، جو خلق کو اللہ کے دین کی راہ بتا سکے اور دنیا پر اتمامِ حجّت کر سکے۔ جب تک یہ چیز دنیا میں موجود نہیں ہے ہر مسلمان کا سب سے مقدم، سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ مقصد یہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے کرے اسی کے لیے ہر مسلمان کو سونا اور جاگنا چاہئے۔ اسی کے لیے کھانا پینا چاہئے۔ اور اسی کے لیے مرنا اور جینا چاہیے۔ اس کے بغیر مسلمانوں کی زندگی خدا کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ اور اللہ تعالےٰ کے یہاں وہ اپنی اس کوتاہی کے لیے کوئی عذر نہ کر سکیں گے۔

یہ چیز ان کی ہستی کی غایت ہے۔ اگر اس کو انھوں نے کھو دیا تو جس طرح وہ تمام چیزیں جو اپنے مقصدِ وجود کو کھو کر کوڑے کرکٹ میں شامل ہو جاتی ہیں اسی طرح یہ بھی اس زمین کے خس و خاشاک سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے اور ان کے لیے یہ ہرگز زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو اُمّتِ یا خیرِ اُمّت کے لقب کا مستحق سمجھیں، یا اللہ تعالےٰ سے کسی نصرت و حمایت کی امید رکھیں۔

انبیائے کرام پہلے کن کو مخاطب کرتے ہیں

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنے مقصد کی تبلیغ کے لیے پہلے کن لوگوں کو مخاطب کرتے ہیں اور کس طرح مخاطب کرتے ہیں ؟ سوال کے پہلے جزو کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو انبیاء کی بعثت ان کی پوری قوم کی طرف ہوتی ہے۔ لیکن کیا وہ آغازِ کار ہی میں پوری قوم کو مخاطب کرتے ہیں یا شروع شروع میں ان کا تخاطب قوم کے کسی خاص طبقہ سے ہی ہوتا ہے ؟ اگر کسی خاص طبقہ ہی سے ہوتا ہے تو وہ کون سا طبقہ ہے ؟ عامۃ النّاس کا یا ان لوگوں کا جو عامۃ الناس کی قیادت و رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں ؟ سوال کے دوسرے جزو کا منشا یہ ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر نبی کی قوم شروع شروع میں اس کی دعوت سے بیگانہ بلکہ اس کی شدید مخالف رہی ہے۔ پھر کیا انھوں نے سب کو منکر و کافر فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز " اے کافرو! ایمان لاؤ"۔ اے مشرکو! اللہ کو ایک مانو " سے کیا، یا ان کا طرزِ خطاب کچھ اور ہوا ؟ یہ دونوں سوال نہایت اہم ہیں۔ ان کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگوں نے دعوت کے نقطۂ آغاز کو متعین کرنے میں بھی غلطیاں کی ہیں اور بہتیرے اپنا اور اپنے مخاطبوں کی صحیح پوزیشن سمجھنے میں بھی افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں جس کا نتیجہ یا تو یہ ہوا کہ ساری دعوت ایک غلط نقطہ سے شروع ہونے کی وجہ سے بے اثر رہ گئی۔ یا داعی اور مدعو کا صحیح موقف متعین نہ ہونے کی وجہ سے اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کر لی اور اصلاح کے بجائے اس سے بڑے بڑے فسادات اُٹھ کھڑے ہوئے۔

انبیاءؑ کا خطاب وقت کے لیڈروں سے

اس فصل میں ہم سوال کے پہلے حصہ کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اُس تاریخ کی روشنی میں جو قرآن نے پیش کی ہے، ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام سب سے پہلے قوم کے اربابِ اثر کو مخاطب کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کو عوام کی اصلاح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے خود اپنے اس خاندان کو دعوت دی جو قوم کی مذہبی پیشوائی کی مسند پر متمکن تھا۔ پھر اس بادشاہ کو دعوت دی جس کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار کی باگ تھی اور جو اپنے آپ کو لوگوں کی زندگی اور موت کا مالک سمجھے بیٹھا تھا (اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِیْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ[۱] (بقرہ) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ سب سے پہلے فرعون کو مخاطب کریں (اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓی اَنْ تَزَكّٰی وَاَهْدِیَكَ اِلٰی رَبِّكَ فَتَخْشٰی[۲]) حضرت دانیال علیہ السلام نے اپنے وقت کے شہنشاہ اعظم بنوخذنصر کو دعوت دی۔ یرمیاہ نبی نے شمال کے بادشاہوں پر نبوت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے سب سے پہلے علمائے یہود کو دعوت دی۔ اسی طرح نوح علیہ السلام، ہود علیہ السلام، لوط علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، سب کی دعوتیں قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ہر نبی نے سب سے پہلے اپنے وقت کے اربابِ اقتدار اور متکبرین کو جھنجھوڑا اور ان کے افکار و نظریات پر ضرب لگائی۔ سب سے آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپؐ کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی

---

[۱] تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں کج بحثی کی، محض اس غرور کے سبب سے کہ خدا نے اس کو سلطنت دے رکھی تھی۔

[۲] فرعون کے پاس جاؤ اس نے سرکشی کی ہے اور اس سے کہو کیا تجھ میں کچھ اس بات کی رغبت ہے کہ تو پاکیزگی حاصل کرے اور میں تجھے تیرے رب کی راہ سمجھاؤں تو تو اس سے ڈرے۔

رشتہ داروں کو ڈراؤ۔ یہ لوگ عرب کی مذہبی اور پدرسرانہ PATRISRCHICAL حکومت کے ارباب حل وعقد تھے۔ اور اس واسطے سے سارے عرب کی اخلاقی اور سیاسی رہنمائی کر رہے تھے۔ عرب کے علاوہ بقیہ دنیا کو دعوت دینے کے لیے بھی آپؐ نے امتِ وسط کو جو طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے متعدد سلاطین عالم کو نامے لکھے، اور اسلام کو پہلے ان کے سامنے پیش کیا اور ان سے مطالبہ کیا کہ "اسلام لاؤ سلامت رہو گے، ورنہ تمہاری اور تمہارے زیر دستوں دونوں کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر آئے گی"۔ یہ اس امر کی طرف اشارہ تھا کہ بعد میں امت کے ارباب حل وعقد دعوتِ عام کے لیے اسی طریقہ کی پیروی کریں اور خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے اسی طریقہ پر تبلیغ عام کی وہ ذمہ داری ادا کی جو ان پر شہداء علی الناس کی حیثیت سے، اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ڈالی گئی تھی۔

حضرتِ مسیحؑ کا خطاب

یہ ایک امر واقعہ ہے جس سے کوئی شخص، جس نے انبیاء کی تاریخ پڑھی ہو، انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ساتھ ہی اس واقعہ سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بام و در پر آفتاب ہدایت کی کرنیں سب سے پہلے پھیلتی ہیں، تقدیر کی نیرنگی سے، قبولِ ہدایت میں سب سے پیچھے وہی رہتے ہیں۔ حبش کے بلالؓ، روم کے صہیبؓ، فارس کے سلمانؓ اور مدینہ کے کسان دُور دُور سے آتے ہیں اور داخلِ اسلام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن قریش کے لیڈر ابولہب، ابوجہل، امیہ بن خلف وغیرہ اور طائف کے اشراف، جن کے سامنے خدا کا رسول شب و روز دعوتِ حق بلند کرتا ہے، اس برکت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے اگر فیض پاتے بھی ہیں تو وہ غریب عوام جن کی طرف ابھی دعوت کا خطاب براہِ راست نہیں بلکہ بالواسطہ ہے۔ جو لوگ ترتیبِ دعوت میں آگے ہیں وہ قبولِ دعوت میں پیچھے رہ جاتے ہیں اور جو ترتیب دعوت میں پیچھے ہوتے ہیں وہ قبول دعوت میں آگے ہو جاتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ بات پوری ہو کے رہتی ہے کہ "کتنے ہیں جو آگے ہیں، وہ پیچھے رہ جائیں گے اور کتنے ہیں جو پیچھے

ہیں وہ آگے ہو جائیں گے "۔

لیکن اس واقعہ کے باوجود حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنی دعوت کی ترتیب نہیں بدلتے ، اور عامۃ النّاس کو اس وقت تک براہِ راست مخاطب نہیں کرتے جب تک وقت کے کارفرما عناصر اور لیڈر حضرات اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ان کو مایوس نہ کر دیں ۔ حضرت مسیح علیہ السلام اپنی بعثت کے بعد برابر علمائے یہود کے جمود پر ضربیں لگاتے رہے لیکن ایک عرصہ کی جدوجہد کے بعد بھی جب ان کے کبر و غرور اور پندارِ سیادت کی چٹان نہ ٹوٹی تو وہ ان کو چھوڑ کر جھیل کے کنارے ماہی گیروں کے پاس چلے گئے اور ان کو دعوت دی کہ " اے مچھلیوں کو پکڑنے والو! آؤ میں تمہیں آدمیوں کا پکڑنے والا بنا دوں "۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان ہی کے اندر سے ان کو ایسے اہلِ ایمان دیئے جو ان کے حواری کہلائے :

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۔ (۵۲ ، آل عمران)

جب عیسیٰؑ نے ان کی (علمائے یہود کی) طرف سے کفر پر اصرار کو بھانپ لیا تو (عام لوگوں کو مخاطب کر کے) کہا کون اللہ کی طرف بڑھنے میں میرا مددگار ہوتا ہے حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے اور گواہ رہیے کہ ہم اس کے فرمانبردار ہیں ۔

اس آیت میں ان کی دعوتِ عام کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اس وقت بلند کی ہے جب وہ وقت کے علماء اور لیڈروں کے قبولِ حق کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں ۔ اس وقت انھوں نے اپنی دعوت غربا اور عوام کے سامنے پیش کی اور ایسے درد کے ساتھ پیش کی کہ جس دعوت سے یروشلم کے پشتینی دربندار ذرا نہ پسیجے اس نے دریا کے کنارے کے ملاحوں کے دلوں کو موم کر دیا ۔ اور بالآخر ان ہی کے اندر سے دعوتِ حق کے وہ خادم پیدا ہوئے جنہوں نے بڑی بڑی زہرہ گداز آزمائشوں کا مقابلہ کر کے اس کو دنیا میں

غالب اور فتح مند کیا۔ سورۂ صف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ ع (الصّف - ۱۴)	اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو، جس طرح کہ عیسیٰ بن مریمؑ نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے تو حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں تو ایک گروہ بنی اسرائیل میں سے ایمان لایا (حواریوں کا گروہ) اور ایک گروہ نے کفر کیا (علمائے سادات کے گروہ نے) پس ہم نے مدد کی ان لوگوں کی جو ایمان لائے ان لوگوں کے خلاف جو ان کے دشمن تھے پس وہ لوگ غالب ہو گئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے ہدایت و ضلالت کے باب میں تقدیر کی اس نیرنگی پر کہ آگے بڑھنے والے پیچھے رہ جائیں اور پیچھے والے آگے نکل جائیں۔ نہایت مؤثر اور بصیرت افروز مثلیں بھی کہی ہیں، لیکن بحث بالکل دوسرے گوشہ میں نکل جائے گی۔ اس وجہ سے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں یہاں صرف اس حقیقت کو ہم سامنے لانا چاہتے ہیں کہ اگرچہ قبولِ دعوت میں عموماً سبقت عام لوگ ہی کرتے ہیں۔ جو ترتیب دعوت میں مؤثر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حضرات انبیائے کرامؑ جب تک وقت کے ذہن اور کارفرما عناصر سے مایوس نہیں ہو جاتے اس وقت تک عامۃ النّاس کو براہ راست مخاطب نہیں کرتے۔

آنحضرتؐ کا خطاب

غور کر کے دیکھئے تو بعینہٖ یہی صورتِ حال آپ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی نظر آئے گی۔ آپؐ نے پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق، قریش کو دعوت دی جو سارے عرب کے مذہبی و سیاسی پیشوا تھے، اور ان

کے سرداروں میں سے ایک ایک کے سامنے اللہ کے دین کو پیش کیا۔ جب ان کی طرف سے نفرت اور مخالفت کا مظاہرہ ہوا تو آپؐ نے ان کے قبولِ اسلام کے لیے دعائیں بھی کیں، ان میں سے بعض بعض کے لیے جو قوم میں خاص اہمیت رکھتے تھے آپؐ نے تعین کے ساتھ نام لے کر بھی دعا فرمائی۔ مثلاً منقول ہے کہ آپؐ نے دعا فرمائی کہ:

"اے اللہ! عمر یا ابوجہل کے اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت دے"۔ ان لوگوں کے قبولِ اسلام کا شوق آپؐ پر اس قدر غالب تھا کہ اس جوش میں نہ آپؐ کو اپنے ضروری آرام کا خیال رہتا، نہ اپنے مرتبہ اور عظمت کا بلکہ بسا اوقات یہ انہاک آپؐ پر اس قدر غالب ہو جاتا کہ ان مسلمانوں کی تربیت کے لیے بھی آپؐ کے پاس وقت نہ بچتا جو نعمتِ اسلام سے بہرہ ور ہو چکے ہوتے اور تربیت کے محتاج ہوتے لیکن ان ساری باتوں کے باوجود آپؐ بعثت کے بعد ایک مدت تک ان ہی لوگوں کے ساتھ مشغول رہے اور ان کے ہر قسم کے طعن و طنز، تحقیر و استہزا اور عناد و اختلاف کو برداشت کرتے رہے۔ لیکن اس چیز کی ایک حد تھی جس کے بعد ان لوگوں کو زیادہ اہمیت دینا اور ان کے پیچھے پڑے رہنا خود دعوت کے وقار کے خلاف تھا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر پہونچنے کے بعد آپؐ کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روک دیا، اور صرف ان لوگوں کی طرف متوجہ ہونے کا حکم دیا جو یا تو ایمان لا چکے تھے یا جن سے توقع تھی کہ اگر ان کو کوئی نصیحت کی جائے گی تو، چونکہ وہ لیڈری کے مخصوص امراض سے پاک ہیں اس وجہ سے، سنیں گے اور مانیں گے۔ یہی مقام ہے جہاں پہنچ آپؐ کو متکبرین سے اعراض کا حکم دیا گیا ہے:

فَتَوَلَّ عَنۡهُمۡ فَمَآ اَنۡتَ بِمَلُوۡمٍ وَّذَكِّرۡ فَاِنَّ الذِّكۡرٰى تَنۡفَعُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝ (۵۴، ۵۵ ذاریات)	پس ان (متکبرین) سے اعراض کرو، اب تم کو کوئی ملامت نہیں ہے (کیونکہ تم نے اپنا حق ادا کر دیا) اور نصیحت کرو (ان کو جو داخلِ اسلام ہو چکے ہیں) کیونکہ نصیحت اہلِ ایمان کو نفع پہنچاتی ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۙ اَنْ جَآءَهُ
الْاَعْمٰى ۙ وَمَا يُدْرِيْكَ
لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۙ اَوْ يَذَّكَّرُ
فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۙ اَمَّا
مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَاَنْتَ
لَهٗ تَصَدّٰى ۙ وَمَا عَلَيْكَ
اَلَّا يَزَّكّٰى ۙ وَاَمَّا مَنْ
جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ
اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ
شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِيْ صُحُفٍ
مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ
مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِاَيْدِيْ
سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۙ
(عبس)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس بات کے سبب سے کہ اس کے پاس نابینا آیا اور تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے یا یاددہانی حاصل کرے تو یاددہانی اسے نفع پہنچائے، لیکن وہ جو بے پروائی کرتا ہے، تو اس کے تم پیچھے پڑتے ہو، حالانکہ اگر وہ پاکی نہ حاصل کرے تو تم پر اس کا الزام نہیں ہے اور وہ جو تمہارے پاس ذوق و شوق سے آتا ہے اور وہ خدا سے ڈرتا بھی ہے اس سے تم غفلت برتتے ہو ہرگز نہیں (ان متکبرین کی کی اس قدر پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے) یہ تو ایک یاددہانی ہے سو جس کا جی چاہے اس کو حاصل کرے، قابلِ احترام، بلند اور پاک صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوقار منشیوں کے ہاتھ میں۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ
اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ
لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ (۸۸ - الحجر)

اور ان کفار کی بعض جماعتوں کو جس مال و متاع سے ہم نے بہرہ ور کر رکھا ہے اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ اور ان کی بدبختی پر غم نہ کرو اور اپنا دامنِ شفقت اہلِ ایمان پر ڈال لو۔

اس طرزِ خطاب کے وجوہ | حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا اپنی دعوت میں یہ ترتیب

اختیار کرنا محض ایک اتفاقی واقعہ نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ اسباب ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

پہلی وجہ : اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ واضح وجہ تو یہ ہے کہ عوام النّاس علم وعمل اور اخلاق و کردار میں ان لوگوں کے تابع ہوا کرتے ہیں جو سوسائٹی میں اثر و اقتدار رکھتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشہور ہے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ (لوگ اربابِ اقتدار کے دین پر چلتے ہیں) اس وجہ سے اگر اربابِ اقتدار اصلاح قبول کرلیں تو عوام النّاس خود بخود ٹھیک ہو جاتے ہیں اور اگر یہ بگڑے رہیں تو عوام الناس اولاً تو کوئی اصلاح قبول نہیں کرتے اور اگر قبول کر بھی لیتے ہیں تو اس کا اثر بہت جلد اڑ جایا کرتا ہے۔

دوسری وجہ : دوسری وجہ یہ ہے کہ انبیائے کرامؑ امتیاز رکھنے والے طبقات (PRIVILBGED - CLASSES) کے خلاف نہ تو کسی سیاسی یا معاشی تعصّب میں مبتلا ہوتے، اور نہ ہی گرے ہوئے طبقات کے لیے ان کے دلوں میں کوئی بیجا عصبیت ہوتی ہے کہ وہ طبقاتی جنگ برپا کرکے مقدم الذکر کو پست اور مؤخر الذکر کو بلند کرنے کی کوشش کریں۔ وہ جو مشن دنیا میں لے کر آتے ہیں وہ کسی فساد کو دوسرے فساد سے بدل دینے سے پورا نہیں ہوسکتا۔ بلکہ پوری سوسائٹی کو خدا پرستی، صلہ رحمی اور خوفِ آخرت کی اساس پر قائم کرنے سے پورا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے عوام ہوں یا خواص وہ دونوں کو یکساں محبّت و ہمدردی کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور دونوں کے لیے یکساں طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنی اپنی بیماریوں سے پاک ہوکر صحت قبول کرلیں البتہ اصلاح کی جدوجہد میں وہ اونچے طبقات کی اصلاح کو مقدم رکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ درحقیقت ان ہی کی بیماریاں ہوتی ہیں جن کی چھوت سے دوسرے بیمار ہوتے ہیں۔ پس ان کے علاج کی فکر وہ پہلے کرتے ہیں، تاکہ ان کے تندرست ہوجانے کے بعد دوسروں کے علاج میں کچھ زیادہ زحمت باقی نہ رہے۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا طریقہ ہے جو اونچے طبقات کے خلاف ایک قسم کا معاشی تعصب یا انتقام کا جذبہ

رکھتے ہیں۔ یہ لوگ عوام کو سرمایہ داروں کے خلاف بھڑکا کر طبقاتی جنگ برپا کرتے ہیں جس کے نتیجے کے طور پر ان کے خیال میں وہ عوامی ڈکٹیٹر شپ وجود میں آجاتی ہے جو ان کے نزدیک تمام خیر و فلاح کا سرچشمہ ہے۔ حالانکہ اس تمام خون خرابہ کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ پُرانے سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹر شپ ختم ہوتی ہے اور نئے سرمایہ داروں کی ڈکٹیٹر شپ اس کی جگہ لے لیتی ہے، اور ظلم و ناانصافی کا اجارہ جو اب تک چند پُرانے خاندانوں کو حاصل تھا وہ چند نئے خاندانوں کو حاصل ہو جاتا ہے۔ اس انقلاب سے دنیا کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک گروہ کی آتشِ انتقام بجھ جاتی ہے اور ظلم و ناانصافی اور جاہ و اقتدار کی جو خواہشیں وہ اب تک دبائے ہوئے بیٹھا تھا اور جن کو اُبھرنے کا کوئی موقع نہیں مل رہا تھا اُن کے اُبھرنے اور کھل کھیلنے کی راہیں کُھل جاتی ہیں۔ جن کا منتہائے نظر صرف اسی قسم کی اصلاح ہو تو وہ تو بلا شبہ اس عوام بازی سے اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن انبیاء جس انقلاب کو برپا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ صرف اتنے سے پورا نہیں ہو سکتا کہ زار کو اسٹالن اور لینن سے بدل دیا جائے۔ بلکہ وہ بڑے اور چھوٹے ہر ایک کے اندر سے ظلم اور ناانصافی کے محرکات ختم کر دینے سے پورا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس قسم کی ہلڑ بازی ان کے مقصد کے بالکل خلاف ہے۔

تیسری وجہ: تیسری وجہ یہ ہے کہ جو طبقہ قوم میں اونچا ہوتا ہے عموماً ذہنی اعتبار سے وہی برتر ہوتا ہے۔ یہ ذہنی برتری ہی درحقیقت ان کو قیادت کی جگہ دلاتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی دعوت جس کا مقصد ایک اہم فکری و عملی انقلاب ہو، ان کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ یہ لوگ اگر کسی صحیح فکر کو قبول کر لیں تو اس کی اساس پر کسی بڑے سے بڑے نظام کو چلا سکتے ہیں۔ اس پہلو سے یہ ایک بڑی قیمت رکھتے ہیں اور ان کو ضائع کرنے میں اصلی نقصان خود ان کو نہیں پہنچتا بلکہ اس سوسائٹی کو پہنچتا ہے جس کے اندر سے اس طبقہ کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ اگر عوامی انقلاب برپا کر کے یہ ختم کر دیئے جائیں تو پوری سوسائٹی بالکل اس دودھ کے مانند رہ جاتی ہے جس کا مکھن نکال لیا گیا ہو۔ ایسی سوسائٹی جب انقلاب کی رستخیز سے فارغ ہو کر زندگی کی نئی تعمیر کے نقشے بناتی ہے

تب اس کو اپنے دیوالیہ پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس وقت اسے اعلانیہ نظر آتا ہے کہ آگے کے کاموں کے لیے جو ذہنی و فکری صلاحیتیں درکار ہیں ان صلاحیتوں سے اس کی فوج بالکل خالی ہو چکی ہے۔ روس کے پہلے انقلاب کے بعد بالکل یہی صورت پیش آئی تھی۔

انقلاب کے خاتمہ پر جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت آئی وہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اپنے نظریات پر حکومت کا انتظام کس طرح چلائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آگ اور خون کی ہولی کھیل کر جو اقتدار انھوں نے حاصل کیا وہ اقتدار خود سنبھال نہ سکے بلکہ سنبھالنے کے لیے اس کو ان ہی لوگوں کے حوالہ کرنا پڑا جن سے وہ چھینا گیا تھا۔ یہ گروہ ہنگامۂ عام سے مرعوب ہو کر ان نئے نظریات کے آگے جھک تو ضرور گیا تھا۔ لیکن اپنے دل کے اندر ان کے خلاف سخت نفرت و عداوت چھپائے ہوئے تھا۔ اس وجہ سے اس اقتدار کو اس نے بالکل منافقانہ طور پر استعمال کیا، اور اس کے ہاتھوں اس پہلے اشتراکی انقلاب کا حشر وہی ہوا جو کسی تحریک کا اس کو منافقانہ طور پر اختیار کرنے والوں کے ہاتھو ہو سکتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقۂ دعوت اس قسم کی غلطیوں سے بالکل پاک ہے۔ وہ اپنی دعوت سب سے پہلے ذہین طبقہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں سے جو لوگ ذہانت کے ساتھ سیرت کی بلندی بھی رکھتے ہیں وہ جب اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی تائید سے دعوت کی قوت دو چند ہو جاتی ہے خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام[1] میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اسی طریق دعوت کی برکت تھی کہ اسلام کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ اور عمر فاروق رضؓ جیسے لوگ مل گئے جنھوں نے ایک طرف تو اپنی ذہانت کی وجہ سے اصل دعوت کی فکری روح کو اس طرح اپنے اندر جذب کر لیا کہ وہ بذاتِ خود اصل دعوت کے شارح و مفسر بن گئے، اور دوسری طرف اپنے کردار کی بلندی کی وجہ سے اپنے اندر وہ ایسی ہمتِ مردانہ رکھتے تھے کہ اس دعوت کی اساس پر انھوں نے ایک پورا نظامِ اجتماعی مرتب کر کے

---

[1] جو تمہارے اندر جاہلیت میں بہتر تھے وہ اسلام میں بھی بہتر ثابت ہوں گے بشرطیکہ وہ حق کو سمجھ جائیں۔

اس کو چلا دیا اور دنیا کو دکھا دیا کہ اسلام عملی حیثیت سے یہ کچھ چاہتا ہے۔

چوتھی وجہ : چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہ طبقہ مادّی اعتبار سے بھی برتر ہوتا ہے۔ یہ مادّی برتری فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ہے کہ اس سے لازماً نفرت ہی کی جائے۔ اس کے اندر برائی کا اگر کوئی پہلو ہے تو صرف اس صورت میں جب یہ باطل کی تائید و تقویّت کا ذریعہ ہو۔ اگر باطل کے بجائے یہ حق کی تائید و تقویت کا ذریعہ بن جائے تو جس طرح سلیمانؑ کی شوکت اور ذوالقرنین کی سلطنت ایک نعمت و برکت تھی اسی طرح یہ مادّی برتری اللہ تعالےٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے اربابِ جاہ کو حق کی دعوت پہنچانے میں جو اس قدر انہماک تھا اس میں جہاں اور پہلو مدِنظر تھے وہاں خاص طور پر یہ چیز بھی پیشِ نظر تھی کہ اگر یہ لوگ دعوت کو قبول کرلیں گے تو جن مادّی اسباب و وسائل پر یہ قابض ہیں وہ آپ سے آپ حق کی نصرت و اعانت کے لیے وقف ہوجائیں گے۔ اس سے ایک طرف تو یہ ہوگا کہ باطل کے ہاتھوں سے ایک بہت بڑی طاقت چھن جائے گی اور دوسری طرف یہ ہوگا کہ یہی طاقت باطل کے خلاف لڑنے کے لیے حق کے ہاتھوں میں ایک زبردست تلوار بن جائے گی۔ ہر دعوتِ حق کا آغاز بے سروسامانی ہی کی حالت میں ہوتا ہے اور وہ اسی طرح آہستہ آہستہ وقت کے مادّی وسائل و ذرائع کو، فتح اور ایجاد و اختراع کی قابلیتوں کو، اور علوم و فنون کی طاقتوں کو مسخّر کرتی ہے اور جب وقت آتا ہے ان کو باطل کے خلاف صف آرا کردیتی ہے۔ اس بات کو جس طرح دنیا کی ہر تحریک کا لیڈر چاہتا ہے اسی طرح حضرات انبیائے کرامؑ بھی اس کو چاہتے ہیں۔ لیکن دوسروں میں اور انبیائے کرامؑ میں یہ فرق ہے کہ ان کے یہاں یہ چیز اتنی اہمیت کبھی نہیں حاصل کرتی کہ اس کے آگے خود اصل مقصد غیر اہم ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے جس منزل میں یہ خواہش اپنی اصلی حد سے متجاوز ہونے لگتی ہے وہاں اللہ تعالیٰ اپنے انبیاءؑ کو روک دیتا ہے کہ تم کفّار کے مال و جاہ کی طرف نظر نہ اُٹھاؤ، تمہاری دعوت اپنا زاد و راحلہ اور اپنی حفاظت و ترقی کے سروسامان خود اپنے ساتھ رکھتی ہے، اور اللہ تعالےٰ تمہارا اور تمہاری دعوت کا

خود کفیل ہے :۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ۬ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ○ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ○

(طٰہٰ ۱۳۲)

اور ان کفّار کے بعض گروہوں کو آزمائش کے لیے معیشت دنیا کی جو چمک دمک ہم نے دے رکھی ہے اس کی طرف نگاہ نہ اُٹھاؤ، اور تمہارے پروردگار کی روزی زیادہ بہتر اور زیادہ پائیدار ہے اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو روزی رسانی کا مطالبہ ہم تم سے نہیں کرتے، روزی ہم تم کو پہنچائیں گے اور انجام کار کی فتح تقویٰ کے لیے ہے۔

پانچویں وجہ : پانچویں وجہ یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السّلام دنیا میں ایک ایسے نظامِ حق کو برپا کرنے کے لیے آتے ہیں جس کی بنیاد خدا کی بندگی، ایماندارانہ تنقید، بے رورعایت احتساب، اجتہاد اور شوریٰ پر مبنی ہو نہ کہ شخصیت پرستی پر، اس وجہ سے قدرتی طور پر وہ سب سے پہلے ان لوگوں کو تلاش کرتے ہیں جن کی طبیعت میں کم از کم اتنی بلندی ہو کہ وہ اشخاص کے پیچھے چلنے کے بجائے اپنی فکر و رائے کے پیچھے چل سکیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ جوہر نہ ہو وہ اس مقصد کے لیے بالکل بیکار ہیں جس کو لے کر حضرات انبیائے کرامؑ آتے ہیں۔ یہ جوہر رکھنے والے اشخاص یوں تو ہر طبقہ کے اندر ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں لیکن جواہرات کی تلاش بہرحال پہلے معدن ہی میں کی جاتی ہے نہ کہ گھورے پر۔ اس وجہ سے اپنے مقصد کے آدمی چھانٹنے کے لیے حضرات انبیائے کرامؑ پہلے سوسائٹی کے ذہین طبقہ ہی کو مخاطب کرتے ہیں، اور جب تک ان کی طرف سے مایوس نہیں ہو جاتے، دوسری طرف نگاہ نہیں اٹھاتے۔ اس کے برعکس جو لوگ اصول و مقاصد کے بجائے اپنی شخصیتوں کی پرستش کرانا چاہتے ہیں وہ ہمیشہ ذہین طبقہ سے کترا کر عوام میں

اپنی تحریک چلاتے ہیں اس طرح کے لوگ اگر کچھ سیاسی قابلیت و ہمّت رکھتے ہیں تو اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کر لیتے ہیں، اور اگر سیاسی قابلیت نہیں رکھتے یا قابلیت تو رکھتے ہیں لیکن اس کے لیے پوری ہمّت نہیں رکھتے تو بس ایک عوامی لیڈر بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور اگر کچھ مذہبی سوانگ رچانا جانتے ہیں تو پیری مریدی کی ایک گدّی قائم کر لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ ذہین طبقہ سے اسی طرح گھبراتے ہیں جس طرح چور دن کی روشنی سے گھبراتا ہے۔ ان کے سارے کھیل اندھیرے ہی میں کھیلے جا سکتے ہیں اس وجہ سے یہ اندھیرے ہی کو پسند کرتے ہیں۔

چھٹی وجہ: چھٹی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سوسائٹی کے ذہین طبقہ کو چھوڑ کر اس کے عوام سے تحریک شروع کی جائے تو عوام میں سے لوگ اس تحریک کو قبول کرتے ہیں وہ شبہوں اور اندیشوں میں بلکہ ایک قسم کے احساسِ کمتری کے مرض میں مبتلا رہتے ہیں، اور جب تک سوسائٹی کے اونچے طبقہ کے کچھ لوگ اس تحریک کے ہمنوا نہ بن جائیں اس وقت تک ان کے اندر اس کے لیے وہ شرح صدر نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اس کے اثر سے سرشار ہو کر اس کے لیے کوئی بازی کھیل سکیں۔

اس کی نفسیاتی وجہ بالکل کھلی ہوئی یہ ہے کہ وہ اگرچہ خود اس تحریک کے معتقد ہو چکے ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ابھی ان لوگوں کو اس تحریک نے مفتوح نہیں کیا ہے جن کی ذہنی و مادّی برتری وہ اب تک تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس کی وجہ کبھی تو وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قبول نہ کرنے والوں ہی کا قصور ہو سکتا ہے اور کبھی یہ بھی خیال کرتے ہیں کہ ممکن ہے تحریک کے فلسفہ ہی میں کوئی ضعف ہو، جو اُن کو نظر آ رہا ہو اور ان کو نہ نظر آ رہا ہو۔ یہ تذبذب کی بیماری ان کو تحریک کے لیے بالکل بیکار بنا کر چھوڑ دیتی ہے۔ اور وہ اقرار کر کے بھی گویا انکار کرنے والوں ہی کی صف میں رہتے ہیں۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا طریقہ اس خامی سے بالکل پاک ہے۔ وہ شروع ہی میں ان لوگوں کے افکار و نظریات پر حملہ کرتے ہیں جن کی قیادت میں سوسائٹی کا نظام چل رہا ہوتا ہے اور کچھ دنوں کی کش مکش کے بعد وہ ایک طرف تو وقت کے اخلاقی، سیاسی

اور مابعد الطبیعی فلسفہ کی جڑیں اکھاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور دوسری طرف ان لوگوں کو زِچ کر دیتے ہیں جو اس غلط فلسفہ پر نظامِ اجتماعی و سیاسی کو چلا رہے ہوتے ہیں۔ اس دوران میں عوام النّاس تقریباً غیر جانبدار رہ کر اس ساری کش مکش کا نہایت غور سے مطالعہ کرتے ہیں اور اندازہ کرتے ہیں کہ اس معرکہ میں حق کس کی جانب ہے۔ بعض پر جو ذہین ہوتے ہیں، پہلے ہی مرحلہ میں واضح ہو جاتا ہے کہ حق پیغمبر کے ساتھ ہے، اور وہ اس کو قبول بھی کر لیتے ہیں، باقی جو زیادہ ذہین نہیں ہوتے کچھ عرصہ تک تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیکن جب یہ کش مکش اس مرحلہ میں پہونچتی ہے جس مرحلہ میں باطل اپنی حمایت اور حق کے ابطال کے لیے اوچھے ہتھیاروں کے استعمال پر اُتر آتا ہے تو ان کے سامنے بھی حق بالکل واضح ہو کر آ جاتا ہے، اور وہ بھی اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں، عوام النّاس کے دونوں گروہ حق کو قبول کرنے میں کچھ آگے پیچھے ہوتے ہیں، لیکن دونوں ہی اس کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کرتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس احساسِ کمتری میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں جس میں سابق الذکر گروہ مبتلا ہو جاتا ہے۔ ان کے دلوں پر سے حق کے مخالفین کا رُعب بالکل اُٹھ چکا ہوتا ہے۔ یہ دیکھ چکے ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے پاس اپنے رویّہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے ہٹ دھرمی اور ضد کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ ان کی مکّاری، خود غرضی اور جعل سازی بھی ان کی نگاہوں کے سامنے پوری طرح آ جاتی ہے، اس وجہ سے ان کی دیرینہ قیادت اور سابقہ عظمت کا احترام بھی ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ یہ بصیرت ان کے اندر احساسِ کمتری کے بجائے ایک احساسِ برتری پیدا کر دیتی ہے اور وہ "بڑوں" کی مخالفت سے جھجکنے اور ڈرنے کی جگہ ان کے مقابل میں حق کی حمایت کرتے ہوئے ایک غیر معمولی رفعت کا احساس کرتے ہیں۔ یہ چیز ان کو ذہنی اور اخلاقی پہلو سے اتنا اونچا کر دیتی ہے کہ اگرچہ وہ بے سر و سامان ہوں۔ اگرچہ ان کی تعداد تھوڑی ہو، اگرچہ ان کی تلواریں چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی ہوں، اگرچہ ان کے تیروں پر تکلوں کی پھبتی چُست کی جاتی ہو، لیکن بڑے بڑے غرقِ آہن سوراؤں اور حسب و نسب اور جاہ و جلال رکھنے والے صنادید کے مقابلہ میں ان کو لا کر ان کے ذریعہ سے بدر کا معرکہ سر کیا

جا سکتا ہے۔

ساتویں وجہ: ساتویں وجہ یہ ہے کہ کسی دعوت کی پائیداری کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ ذہین اور اونچے طبقہ کے لوگوں میں سے اس کے لیے کارکن ملیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا ہے تو اس دعوت کو پائیداری نصیب نہیں ہوتی اور اہلِ بدعت بہت جلد اس میں رخنے پیدا کرکے ساری دعوت کو خراب کر ڈالتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اوپر گزر چکا ہے کہ بنی اسرائیل کے علماء و اعیان میں سے کسی نے ان کی دعوت قبول نہیں کی۔ صرف عوام کے طبقہ سے ان کو کچھ شاگرد ملے۔ ان شاگردوں کے اخلاص، تقویٰ اور ادائے فرض میں شبہ نہیں ہے۔ ان کے بس میں جہاں تک تھا، انھوں نے اس دعوت کو فروغ دینے کی پوری کوشش کی۔ لیکن اس کے باوجود پال نے بہت جلد دینِ مسیحی کو خراب کر ڈالا، اور اپنے اس فساد میں اس نے جس چیز سے سب سے زیادہ کام لیا وہ اس کا یہ پروپیگنڈہ تھا کہ مسیحؑ کے شاگرد غیر تعلیم یافتہ عوام میں سے تھے۔ اس وجہ سے وہ مسیحؑ کی تعلیمات کے اسرار و رموز کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ وہ خود چونکہ یونانی فلسفہ اور تصوف کا ماہر تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ وہ مسیح علیہ السلام کے براہِ راست شاگردوں سے زیادہ اُن کی تعلیمات کو سمجھتا ہے اس وجہ سے عوام پر اس کا جادو چل گیا، اور اس کا یہ پروپیگنڈہ اس قدر مؤثر ہوا کہ اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکا اور دینِ مسیحی نے بہت جلد ایک بالکل ہی مختلف شکل اختیار کرلی۔ اس کے برخلاف چونکہ اسلام کو قبول کرنے والے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ جیسے ذہین لوگ تھے، اس وجہ سے اہلِ بدعت اس میں بآسانی رخنہ پیدا نہ کرسکے۔ بلکہ جہاں تک اسلام کی اصل دعوت کا تعلق ہے وہ ہزارہا انقلابات اور ہزارہا گردشوں اور اہلِ بدعت کی فتنہ انگیزیوں کے باوجود آج تک جوں کی توں باقی ہے۔

خاتمۂ بحث

یہ وجوہ ہیں جن کی وجہ سے انبیائے کرامؑ کا طریقِ دعوت ہمیشہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے پہلے ذہین طبقہ کو مخاطب کیا، اور

یہی طریقہ ان تمام حالات میں نتیجہ خیز ہوسکتا ہے جب کہ کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلّی اصلاح کی کی ضرورت درپیش ہو۔ اگر کسی جگہ اسلام کا نظامِ حق قائم ہو اور اس کے اندر کوئی جزوی خرابی پیدا ہوگئی ہو اور اس کی اصلاح کرنی ہو تو اس صورت میں بلاشبہ صرف اسی گروہ کو مخاطب کیا جائے گا جو مذکورہ خرابی کا ذمہ دار ہے۔ لیکن جہاں سرے سے اسلامی نظام قائم ہی نہ ہو اور کسی جزوی اصلاح کی جگہ کلّی اصلاح کا معاملہ درپیش ہو، وہاں لازم ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ کے طریق پر دعوتِ عام بلند کی جائے اور اس دعوت میں سب سے پہلے اس ملک کے ذہین اور کارفرما عناصر کو خطاب کیا جائے۔ عام اس سے کہ وہ مسلمانوں کی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا غیر مسلموں سے۔ یہ سوال کے پہلے جزء کا جواب تھا۔ اب ہم سوال کے دوسرے حصّہ پر بحث کریں گے:۔

انبیائے کرام کا طریقۂ خطاب

یہ ظاہر ہے کہ انبیاءؑ کی بعثت ہوتی ہی اس زمانہ میں ہے جب کہ حق و باطل میں امتیاز وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر، ناممکن ہوجاتا ہے اور عملاً تمام نظامِ زندگی حق کی جگہ باطل کے قبضہ میں آچکتا ہے۔ ایسے زمانہ میں حق صرف نبی کے ساتھ ہی ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے اس کے دائرے سے باہر حق کے کچھ اجزاء تو پائے جاسکتے ہیں لیکن پورے حق کا پایا جانا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے اگر انبیائے کرامؑ ابتداء ہی میں لوگوں کو اس طرح مخاطب کریں کہ : اے کافرو! ایمان لاؤ، اے مشرکو! توحید اختیار کرو" تو صورتِ واقعہ کے اعتبار سے ان کا یوں دعوت دینا بیجا نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ واقعہ یہی ہے کہ ان کے دائرے سے باہر جو کچھ ہے وہ صرف کفر و شرک ہی ہے۔ لیکن جن لوگوں نے حضرات انبیائے کرامؑ کی تاریخ پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ وہ لوگوں کو اے انسانو! ، اے لوگو! اے میری قوم! اے اہل کتاب!! "اے وہ لوگو جو یہودی ہوئے!! اے وہ لوگو جو نصرانی ہوئے!! " اے لوگو جو ایمان لائے!! وغیرہ خطابات سے سے مخاطب کرتے ہیں، اور ان کا یہی طرزِ خطاب اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک قوم ان کو اپنی عناد اور ہٹ دھرمی اور حق دشمنی سے اس قدر مایوس نہ کردے کہ ان کے لیے قوم سے علیحدگی اور ہجرت کا وقت آجائے۔ جب قوم اپنی حق دشمنی میں اس قدر آگے بڑھ جاتی ہے کہ اہل حق کا وجود اپنے اندر کسی طرح گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی اور تائید حق کی بڑی سے بڑی دلیل بھی

اس کی ضد کے آگے بیکار ہو کے رہ جاتی ہے۔ اس وقت انبیاءؑ اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں اور یہی وقت ہوتا ہے کہ وہ صاف صاف الفاظ میں ان لوگوں کے لیے کافر و مشرک وغیرہ کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں جو اپنے کفر و شرک پر اڑے رہتے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کا اسوہ

یوں تو یہ حقیقت ہر نبی کی دعوت میں واضح ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے مختلف مدارج پر جس شخص کی نظر ہوگی وہ اس حقیقت کا کسی طرح انکار نہیں کرسکتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو، اپنی قوم کو اور اپنے عہد کے بادشاہ کو جن الفاظ سے خطاب کیا ہے ان میں کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ وہ مخاطب کو ایک کافر و مشرک کی حیثیت سے مخاطب کر رہے ہیں۔ لیکن جب دعوت و تبلیغ پر ایک مدت گزر گئی اور دلائل و معجزات کی ساری قوت قوم کی ضد کے مقابلہ میں نہ صرف بے اثر رہی بلکہ یہ ضد اس قدر بڑھ گئی کہ پوری قوم ان کی جان کے درپے ہوگئی اس وقت انھوں نے قوم سے علیحدگی کا اعلان کیا، اور ایسے الفاظ میں کیا جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کے شرک و کفر کے ساتھ رواداری کی جو آخری حد ہوسکتی تھی وہ اب ختم ہوچکی ہے۔ اور اب نہ صرف یہ کہ وہ ان کے کفر و شرک کا اعلان کرنا چاہتے ہیں بلکہ قوم کے ساتھ اس وقت تک کے لیے اپنی نفرت و عداوت کا بھی اعلان کرنا چاہتے ہیں جب تک وہ توحید پر ایمان نہ لائے:۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	تمہارے لیے ابراہیم اور اس کے ساتھیوں
فِیْٓ اِبْرَاهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ	کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے جب انھوں نے
اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا	اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان چیزوں سے
مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ	جن کی تم اللہ کے سوا پوجا کرتے ہو، بالکل بری
دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا	ہیں۔ ہم نے تمہارا انکار کیا اور ہمارے اور تمہارے

وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ۔ (ممتحنہ ، ۴)

درمیان ہمیشہ کے لیے عداوت ونفرت کا اعلان ہوگیا ، یہاں تک کہ تم ایک ہی خدا پر ایمان لاؤ۔

آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اُسوہ

ٹھیک یہی حال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا ہے۔ قربِ ہجرت سے پہلے کی کسی سورہ میں یہ بات نہیں مل سکتی کہ آپؐ نے اپنی قوم کو یا اہلِ کتاب کو صریح طور پر کافر و مشرک یا منافق وغیرہ کے الفاظ سے مخاطب کیا ہو، بالکل ابتدائی سورتوں میں زیادہ تر خطاب یا تو یَاۤ اَیُّهَا الْاِنْسَانُ کے الفاظ سے ہے یا یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ یا یٰقَوْمِ کے الفاظ ہیں۔ اسی طرح اہلِ کتاب کے لیے یَاۤ اَهْلَ الْكِتَابِ کے یا اس کے ہم معنی الفاظ ہیں۔ یہاں تک کہ منافقین کے لیے بھی فتح مکّہ کے بعد تک وہی عام لفظ یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا استعمال ہوتا رہا اور صراحت کے ساتھ ان کو اے منافقو ، کے الفاظ سے کہیں خطاب نہیں کیا گیا۔ لیکن جب ایک مدّت کی دعوت و تبلیغ کے بعد قوم پر اللہ کی حجّت پوری ہوگئی اور نہ ماننے والوں نے نہ صرف یہ کہ مانا نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرلیا اس وقت آپؐ نے ہجرت فرمائی اور کفّارِ قریش کو صاف صاف 'اے کافرو!' کے الفاظ سے مخاطب کیا اور ان سے اور ان کے دین سے اپنی علیٰحدگی کا اعلان کیا۔ اسی ہجرت کے موقع پر یہ سورہ نازل ہوئی جو قریش سے اعلانِ برأت بلکہ اعلانِ جنگ کی سورۃ ہے:

قُلْ يَاۤ اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَاۤ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ وَلَاۤ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَاۤ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَاۤ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝

کہہ، اے کافرو! نہ میں پوجتا ہوں جسے تم لوگ پوجتے ہو اور نہ تم پوجتے ہو جسے میں پوجتا ہوں اور نہ میں پوجنے کا جسے تم لوگ پوجتے آئے اور نہ تم لوگ پوجنے کے جسے میں پوجتا ہوں، تمہیں تمہارا دین اور مجھے میرا دین [1]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کافر اور مرتکبِ کفر میں فرق

انبیائے کرامؑ یہ ساری احتیاط صرف اس حد تک برتتے ہیں جہاں تک کہ لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینے کا معاملہ ہے۔ ان کے کافرانہ اور مشرکانہ اعمال کو کفر و شرک قرار دینے میں انبیائے کرامؑ کبھی کوئی رعایت نہیں فرماتے۔ اس چیز میں اگر کسی وجہ سے وہ کوئی رعایت کرنا بھی چاہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو اجازت نہیں دی جاتی اور سخت سے سخت مخالف حالات کے اندر بھی ان کو یہی ہدایت کی جاتی ہے کہ کسی کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے میں نہ وہ کسی خطرہ کی پروا کریں اور نہ کسی مصلحت کا لحاظ کریں۔ اس کا سبب العیاذ باللہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ لوگوں کو کافر و مشرک قرار دینا چاہتے ہوں۔ لیکن محض فتنہ کے اندیشہ یا اس خیال سے کہ لوگ دعوت سے بدک جائیں گے ایسا کرنے سے احتراز کریں، اس طرح کی مصلحت پرستی ان کے ہاں جائز ہوتی تو کفار جس طرح کے سمجھوتہ کی تجویز پیش کیا کرتے تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو منظور کر کے سارا جھگڑا ختم کر دے سکتے تھے۔ لیکن معلوم ہے کہ کسی پیغمبر نے بھی دین کے بارے میں کبھی اس طرح کی مصلحت کا لحاظ نہیں کیا۔ خواہ اس کی وجہ سے کتنے ہی بڑے بڑے خطرات کا مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑا ہو۔ اس وجہ سے یہ سوال قابلِ غور ہے کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے معاملہ میں جو لوگ اتنے بے پروا اور اتنے بے خوف تھے کہ انھوں نے کفر و شرک کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے میں اتنی احتیاط کی اور ان سے برأت اور علیحدگی کے اعلان میں اتنی دیر لگائی؟

اس فرق کی دو وجہیں

ہمارے نزدیک انبیائے کرام علیہم السلام اعمالِ کفر و شرک کو کفر و شرک قرار دینے کے باوجود ان کے مرتکبین کو کافر و مشرک قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت میں جو دیر لگاتے ہیں اس کی دو نہایت اہم

۱؎ عام طور پر اس سورہ کے آخری الفاظ کو لوگ رواداری کے اعلان پر محمول کرتے ہیں، لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ یہ دراصل اعلانِ برأت اور اعلانِ جنگ ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مولانا حمید الدین فراہیؒ کی تفسیر سورہ کافرون۔

وجہیں ہیں۔

پہلی وجہ : پہلی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں بندوں کو جو کچھ سرزنش وملامت ہے وہ اتمامِ حجت اور تبلیغ کامل کے بعد ہے۔ اگر اتمامِ حجت اور تبلیغ کے بغیر لوگوں پر گرفت یا ان سے اظہارِ بیزاری جائز ہوتا تو اللہ تعالےٰ انبیاءؑ کو مبعوث ہی نہ فرماتا۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ انبیائے کرامؑ لوگوں کو کافر قرار دینے اور ان سے اعلانِ برأت کرنے سے پہلے ان کو اتنا موقع دیں کہ ان پر اللہ تعالےٰ کی حجت پوری ہو جائے اور ان کے انکار کے لیے عنادا ور ہٹ دھرمی کے سوا کوئی اور وجہ باقی نہ رہ جائے۔ یہ کام ایک مدت کی تبلیغ و تعلیم کا محتاج ہے۔ انبیاءؑ کے وقفہ کے زمانہ میں جو تاریکی چھا جایا کرتی ہے وہ اتنی سخت ہوتی ہے کہ اس کے اندر خواص کو بھی راہِ حق سجھائی نہیں دیتی، چہ جائیکہ عوام کالانعام۔ اس وجہ سے ہر گروہ تعلیم و تبلیغ کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ تمام گمراہیاں باپ دادا کی روایات بن کر دلوں میں رچ بس جاتی ہیں اور ان کے ساتھ کچھ لوگوں کے اغراض بھی وابستہ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے مٹانے کے لیے ایک مدت تک جہاد کیا جائے۔

حضرات انبیائے کرامؑ پورے صبر واستقلال کے ساتھ ایک لمبی مدت تک اس جہاد میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ حق اس قدر واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے سوا جن کے باطل کے ساتھ اغراض وابستہ ہوتے ہیں، کوئی اور اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ جب حقِ تبلیغ اس حد تک پورا ہو چکتا ہے تب انبیاءؑ کے لیے یہ بات جائز ہوتی ہے کہ وہ منکرین کے کفر وشرک کا اعلان کر کے ان سے علیحدہ ہو جائیں۔

دوسری وجہ : دوسری وجہ یہ ہے کہ جب پوری سوسائٹی کا نظام، حق کی جگہ باطل کی بنیاد ہی پر قائم ہو کر چلنے لگ جاتا ہے تو ان لوگوں کے لیے بھی حق کی پیروی ناممکن ہو جاتی ہے جو حق کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت زندگی کے ہر گوشہ میں فساد اس طرح گھس جاتا ہے کہ کسی محتاط سے محتاط آدمی کے لیے بھی یہ ممکن نہیں رہ جاتا کہ وہ فساد کے کچھ جرائیم

نکلے بغیر سانس لے سکے۔ ایسی صورت میں اگر اس مجبوری کا لحاظ کئے بغیر انبیائے کرام لوگوں پر کفر و شرک کے فتوے جڑ کر ان سے برائت کا اعلان کر دیتے تو یہ بہتوں پر نہایت شدید ظلم ہوتا۔ اس وجہ سے وہ تکفیر اور اعلانِ برائت سے اپنا کام شروع کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی تبلیغ و دعوت سے ایسا ماحول پیدا ہو کہ اس کے اندر اہلِ حق اپنے اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ یہ ماحول جب پیدا ہونے لگتا ہے اور زندگی کی وہ راہ کھل جاتی ہے جس پر حق پرست چل سکتے ہیں۔ اگرچہ وہ ابھی تنگ اور دشوار گزار ہی ہو، تب وقت آتا ہے کہ جو لوگ اس کو چھوڑ کر محض اپنی تن پروری اور جھوٹی نمائشوں کی خاطر باطل کی راہ پر بھاگے ہوئے چلے جا رہے ہیں، ان کے کفر کا بھی اعلان کر دیا جائے اور ان سے علیحدگی بھی اختیار کر لی جائے۔

موجودہ حالات میں طریقۂ کار حضرات انبیائے کرام کے اس اسوۂ حسنہ سے اگر ہم موجودہ حالات میں رہنمائی حاصل کریں تو یہ امر بالکل واضح ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں جو حالات ہیں وہ بہت سے اعتبارات سے انبیاء کے وقفہ کے زمانہ سے اشبہ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب آج بے کم و کاست ہمارے اندر موجود ہے۔ اس وجہ سے اس وقت دنیا کسی نبی کی ہدایت کی محتاج نہیں ہے اور نہ اب قیامت تک کسی نبی کی محتاج ہوگی، لیکن خلق کی رہنمائی اور مسلمانوں کو حق پر استوار رکھنے کے لیے ہمارا شرعی نظام خلافت کا نظام تھا جو ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے، اس وجہ سے اس وقت دنیا جن خرابیوں اور گمراہیوں میں مبتلا ہو چکی ہے اس کے لیے وہ ایک بڑی حد تک معذور ہے۔ ہم اس کتاب کی ایک فصل میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک کے لیے اب دنیا پر اتمامِ حجت کا فرض اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر ڈالا ہے اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ہی کی بتائی ہوئی صورت یہ ہے کہ مسلمان خلافت کا نظام قائم کریں، جو ایک طرف دنیا کو نیکی اور بھلائی کے راستہ کی دعوت دے۔

دوسری طرف امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ سے مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ خلافت کا نظام قائم نہ رہنے کی وجہ سے ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی پوری نہیں ہورہی ہے بلکہ عملاً ساری دنیا ایک باطل نظام کی گرفت میں آچکی ہے، اور باطل ایسی قوّت وشوکت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے کہ حق کے لیے موجودہ نظامِ زندگی میں کوئی جگہ سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی ہے۔

نظامِ تعلیم، نظامِ تمدّن، نظامِ معاشرت، نظامِ سیاست ہر چیز حق سے منحرف اور باطل کی مددگار ہے۔ یہاں تک کہ اس کے زیرِ سایہ اگر کوئی چھوٹا بڑا کام دین کے نام سے انجام دیا بھی جارہا ہے تو وہ بھی وقت کی فضا کی ناسازگاری کی وجہ سے باطل ہی کو تقویت پہنچا رہا ہے۔ نیک سے نیک انسان جو فی الحقیقت نیکی اور سچائی کے راستے ہی پر چلنا چاہتا ہے، آج چند قدم بھی بغیر مزاحمت کے حق کے راستہ میں نہیں چل سکتا، اگر دُور والے اسے تھوڑی دیر کے لیے بخش بھی دیتے ہیں تو قریب ہی والے اس سے اُلجھتے ہیں اور کسی طرح نہیں چاہتے کہ وہ اپنی منتخب کی ہوئی راہ میں دو قدم بھی آگے بڑھ سکے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ " بدی کی راہ فراخ ہے اور اس پر چلنے والے بہت ہیں، اور نیکی کی راہ تنگ ہے اور اس کے چلنے والے تھوڑے ہیں"۔

یہ چیز آج آنکھوں سے مشاہدہ کی جاسکتی ہے۔ باطل کی منزل پر پہونچنے کے لیے فراخ سڑکیں ہیں، دورویہ درختوں کا سایہ ہے، تیز رو سواریاں ہیں، حفاظت کے لیے بدرقہ ہے، ہر منزل عیش وآرام ہے، آپ جس وقت چاہیں آرام سے منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، اس کے برعکس حق کی راہ پہلے ہی قدم پر رندھی ہوئی ہے اگر آپ ہمّت کرکے اس مزاحمت کو دُور کرلیں تو آگے کی راہ میں ہر قدم پر خطرہ ہے یہاں تک کہ شروع سے لے کر آخر منزل تک خطرہ کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ اور کسی شخص کے لیے بھی آج یہ ممکن نہیں ہے،

کہ سر لیے ہوئے اس راہ میں پاؤں رکھنے کی جرأت کر سکے ۔ ایسے نازک اور پُرآشوب زمانہ میں یہ بات ذرا تعجب انگیز نہیں ہے کہ لوگ راہ سے بے راہ ہو گئے، تعجب انگیز اگر کوئی بات ہو سکتی ہے تو یہ ہو سکتی ہے کہ گمراہی کے اتنے سر و سامان مہیا ہونے، اور شیطان کے ایسے عالم گیر تسلّط کے باوجود خدا کے کچھ بندوں کو اللہ کا نام یاد رہ گیا۔ یہ بیچارے داد کے مستحق ہیں نہ کہ ملامت کے، اور سینے سے لگا لیے جانے کے لائق ہیں، نہ کہ کاٹ پھینکے جانے کے۔ جن لوگوں نے اتنے نامساعد حالات کے اندر اپنی شمعِ ایمان زندہ رکھی ہے، اگر ان کو موافق حالات میسّر آتے تو وہ بہتر سے بہتر مسلمان ہوتے۔ اس وجہ سے ان کی غلطیوں اور غیر شعوری گمراہیوں یا اضطراری ضلالتوں کی بنا پر ان کو ایمان سے محروم قرار دے کر ان سے نفرت کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ ان میں ایمان و اسلام کے صحیح مقتضیات کا شعور بیدار ہو۔

دعوتِ دین میں تدریج

انبیائے کرام علیہم السلام جس طرح لوگوں کو مخاطب کرنے میں ایک خاص ترتیب کا لحاظ رکھتے ہیں اور یہ ترتیب تبلیغ و دعوت کی ایک بہت بڑی حکمت پر مبنی ہے، جو اس ترتیب کو اُلٹ دینے کی صورت میں، جیساکہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں، مفقود ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جن باتوں کو انبیائے کرام پیش کرتے ہیں ان کو پیش کرنے میں بھی وہ ایک خاص تدریج کا اہتمام کرتے ہیں اور وہ تدریج بھی دعوتِ دین میں ایسی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ نہ صرف محنت اکارت ہو کے رہ جائے بلکہ اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ اس سے اُلٹے دعوتِ دین کے مقصد کو نقصان پہنچ جائے۔ اس وجہ سے اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جس طرح ہم نے تفصیل کے ساتھ یہ بات واضح کردی ہے، کہ تبلیغِ دین کے لیے لوگوں کو مخاطب کرنے میں کیا ترتیب اختیار کی جائے۔ اسی طرح تفصیل کے ساتھ یہ بات بھی بیان کردیں کہ دین کو لوگوں کے سامنے پیش کرنے میں کیا تدریج ملحوظ رکھی جائے۔

انبیاء کی دعوت کے مبادی

چونکہ انبیاء کی بعثت ہمیشہ ایسے زمانے میں ہوتی ہے۔ جب نظامِ حق بالکل درہم برہم ہوچکا ہوتا ہے اور ایک جاہلی نظام سوسائٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے، اس وجہ سے وہ سب سے پہلے ان مبادی کی دعوت

بلند کرتے ہیں جن کی بنیادوں پر خالص اسلامی سوسائٹی کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہ مبادی تین ہیں:

۱۔ خدا پر ایمان، کامل توحید کے ساتھ۔
۲۔ رسالت پر ایمان، کامل اطاعت کے ساتھ۔
۳۔ آخرت پر ایمان، کامل تفویض کے ساتھ۔

یہی تین چیزیں ہیں جن کے اندر خرابی پیدا ہونے سے سوسائٹی جاہلیت کی طرف کھسکنی شروع ہوتی ہے، اور جب ان میں پوری طرح فساد رونما ہو جاتا ہے تو پوری سوسائٹی پر جاہلیت کی ظلمت چھا جاتی ہے، اور ان ہی تینوں چیزوں کے آشکارا ہونے سے سوسائٹی اسلام کی طرف بڑھنا شروع کرتی ہے اور جب یہ پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں تو سوسائٹی پورے دن کی روشنی میں آجاتی ہے۔ ان تینوں چیزوں کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندر اتنا راسخ ہے کہ دنیا میں ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ شیطان کو اچھی طرح علم ہے کہ ان ہی چیزوں پر نظام حق کی بنیادیں قائم ہیں، اس وجہ سے اس کی ساری کوشش ہمیشہ اس بات کے لیے رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح ان میں کوئی نہ کوئی رخنہ ضرور پیدا کرے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ جس طرح ان کا انکار بہت کم کیا گیا ہے اسی طرح شیطان کی کوششوں کا یہ اثر ہے کہ ان کا صحیح صحیح اقرار بھی بہت کم کیا گیا ہے۔ ان عقائد کے باب میں دنیا کی اصلی روش نہ انکار کی رہی ہے نہ ہمیشہ صاف صاف اقرار کی، بلکہ بیشتر اقرار مع الانکار کی رہی ہے۔ اور یہی وہ گرہ ہے جو اس رشتہ میں بار بار پڑتی رہی ہے اور جس کو کھولنے کے لیے اللہ تعالےٰ اپنے نبیوں اور رسولوں کو بھیجتا ہے۔

دعوت کی راہ کی ایک مشکل یہ حق و باطل دونوں کی ملاوٹ دعوت و اصلاح کے کام کو بہت مشکل اور دیر طلب بنا دیتی ہے۔ اگر مقابلہ صرف باطل سے ہو تو اس کو آسانی سے سر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جہاں حق و باطل دونوں ملے جلے ہوئے ہوں اور باطل کی حمایت کے لیے حق کو سپر کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہو وہاں حق کی حمایت میں

کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے سے پہلے داعیانِ حق کو ایک جہادِ عظیم اس مقصد کے لیے کرنا پڑتا ہے کہ وہ لوگوں پر یہ آشکارا کر سکیں کہ زیرِ بحث نظام میں اگر کچھ اجزاء حق کے ہیں تو وہ حق کی خاطر نہیں ہیں بلکہ باطل کی خدمت کے لیے ہیں۔

انبیائے کرامؑ کو، اور اُن لوگوں کو جو دنیا کو راہ راست، کی دعوت دیتے ہیں، بالعموم ایسے ایسے ہی فاسد العقیدہ لوگوں سے کش مکش کرنی پڑتی ہے جو خدا کے دین اور اپنے نفس کی خواہشوں میں مصالحت کرا کے ایک نیا نظام کھڑا کرتے ہیں اور اس کو پُرانے نظام کا نام دے لیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے باطل کی حفاظت کے لیے چونکہ حق کو سپر بنائے ہوئے ہوتے ہیں اس وجہ سے ان پر پوری آزادی کے ساتھ بیک دفعہ ضرب نہیں لگائی جا سکتی، بلکہ آہستہ آہستہ ان کے اعمال و معتقدات میں سے حق کے اجزاء کو الگ اور باطل کے اجزاء کو الگ کرنا پڑتا ہے، اور چونکہ ان کا ہر باطل حق بن کر رچ چکا ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی جدائی ان کو اتنی شاق گزرتی ہے کہ وہ ان میں سے ایک ایک پر مورچے قائم کرتے ہیں اور اس وقت تک اس کو نہیں چھوڑتے جب تک اس کی حمایت سے بالکل ہی مایوس نہ ہو جائیں۔ یہ کام بڑا دیر طلب ہے۔ اس میں بڑی دیدہ ریزی، بڑے صبر اور بڑے حلم کی ضرورت پڑتی ہے، اور ساتھ ہی بے لاگ حق پرستی بھی اس راہ میں مطلوب ہوتی ہے، کیونکہ جن لوگوں کے متعلق آدمی کا خیال یہ ہو کہ ان کے انکار کے ساتھ اقرار بھی شامل ہے، قدرتی طور پر ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ نرمی کی طرف مائل ہوتا ہے اور اس نرمی کا بڑا فائدہ باطل کو حاصل ہوتا ہے نہ کہ حق کو۔

تعلیم میں دو باتوں کا لحاظ

اس کش مکش کے نتیجہ کے طور پر جو لوگ حقِ خالص کا ساتھ دینے اور باطل سے اپنا رشتہ یک قلم منقطع کر لینے پر صدق دل کے ساتھ آمادہ ہو جاتے ہیں، وہ لوگ ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو انبیائے کرامؑ ان باتوں کی تعلیم شروع کرتے ہیں جن سے ایک طرف تو وہ خدا سے بہتر سے بہتر طریق پر جڑ جائیں، دوسری طرف آپس میں ایک بنیانِ مرصوص کی طرح مربوط ہو جائیں۔ یہ

خدا اور بندوں سے ٹھیک ٹھیک جوڑ دینے والے اصولوں، ان ہی تین اصولوں سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو ان کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی جو اُن تینوں اصولوں کو مان چکے ہوں۔ ایک اصول کو مان لینے کے بعد کوئی دیانت دار شخص اس کے لازمی نتائج کے تسلیم کرنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایک شئے کے لوازم کی حیثیت تو درحقیقت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوا کرتی ہے۔

لیکن اس تفصیل کو بھی انبیائے کرام مجرد اس اعتماد پر کہ جن لوگوں نے اصول تسلیم کر لیے ہیں وہ لازماً اُن کے نتائج کو بھی مان ہی لیں گے۔ یوں ہی بے ترتیب، لوگوں کے سامنے پھینکنا نہیں شروع کر دیتے، بلکہ ایک حکیمانہ ترتیب و تدریج کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اور اسی ترتیب و تدریج کے اندر ان کے مشن کی کامیابی کا اصل راز مضمر ہوتا ہے۔ اس ترتیب میں دو پہلو مدّنظر ہوتے ہیں۔ ایک جماعت کی ذہنی استعداد کا، دوسرا جماعت کی اجتماعی استطاعت کا، یہ دونوں چیزیں کسی قدر وضاحت کی محتاج ہیں۔

ذہنی استعداد

ذہنی استعداد سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ دین کے احکام و تعلیمات میں ایک نظم (سسٹم) ہے اس کے کچھ بنیادی کلیات ہیں۔ ان سے کچھ مبادی پیدا ہوتے ہیں، پھر ان سے اصولی تعلیمات پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ان سے جزئیات و فروع وجود میں آتی ہیں۔ جو شخص اس ترتیب و تدریج کے ساتھ دین کو سیکھتا ہے وہ ایک طرف تو ہر مرحلہ میں دوسرے مرحلہ کے لیے اپنے اندر استعداد پیدا کر لیتا ہے۔ دوسری طرف اس پورے سسٹم سے واقف ہو جاتا ہے جو اس کے اندر موجود ہے۔

اس کی مثال بالکل یوں ہے کہ ایک بچّہ کو پہلے حروف تہجی کی تعلیم دی جائے، پھر ان کو آپس میں جوڑنا اور ملانا سکھایا جائے، پھر اس کو الفاظ اور جملوں کے پڑھنے کی مشق کرائی جائے پھر اس کے سامنے پڑھنے کے لیے ایک پوری عبارت رکھ دی جائے، چونکہ وہ حروف سے عبارت تک درجہ بدرجہ اس سسٹم کو سمجھتا ہوا آیا ہے جو اس کے اندر ملحوظ ہے، اس وجہ سے ہر منزل میں

اس نے آگے کی منزل کے لیے استعداد خود بخود بہم پہنچالی ہے، اور کوئی چیز اس کی طبیعت پر بار نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ ہر استعداد چونکہ فطرتاً فعل چاہتی ہے۔ اس وجہ سے اس نے ایک درجہ سے دوسرے درجہ میں منتقل ہونے کے لیے اپنی طبیعت کے اندر خود ایک تقاضا محسوس کیا ہے، اس کے برعکس جس شخص نے دین کو اس طرح نہیں پایا ہے، بلکہ اس کے مختلف حصّے اس کے سامنے بے ربط و بے ترتیب رکھ دیئے گئے ہیں۔ اس کی مثال بالکل اس بچّہ کی ہے جس کو تمام ابتدائی مراحل سے گزارے بغیر کوئی عبارت رٹا دی گئی ہو، جس کو وہ رٹ تو لے گا اور حافظہ کی مدد سے اس کو دہرا بھی سکے گا، لیکن وہ ہمیشہ اس کے حافظہ پر ایک بار ہوگی، کبھی اس کی فطری استعداد کا جزو نہیں بن سکے گی۔ انبیائے کرامؑ دین کو پیش کرنے میں یہ طریقہ کبھی نہیں اختیار کرتے، بلکہ فطری اور حکیمانہ ترتیب اختیار کرتے ہیں تاکہ جو لوگ اس کو قبول کریں اپنی طبیعت کی طلب سے قبول کریں، اور پورا دین ان کے فکرو نظر اور روح و دل کے اندر جذب ہو جائے۔ اسی چیز سے وہ رسوخِ ایمان پیدا ہوتا ہے جو آروں سے چیر ڈالے جانے کے بعد بھی دلوں سے نہیں نکلتا، اور اسی سے وہ ذوقِ تقویٰ پرورش پاتا ہے جو زندگی کے پھیلے ہوئے معاملات کے بعید ترین گوشوں میں بھی کوئی چیز روحِ دین کے خلاف برداشت نہیں کر سکتا۔

جو لوگ دین کے اس نظام کو اور انبیائے کرامؑ کے اس طریقِ دعوت کی خوبیوں کو نہیں سمجھتے ہیں، وہ لوگ معرفتِ الٰہی پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کو نہ صرف فرض نمازوں کا بلکہ تہجّد و اشراق تک کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ وہ نبی کی ضرورت اور اس کی اطاعت و پیروی کا اعتقاد پیدا کرنے سے پہلے لوگوں کی ڈاڑھیوں، لبوں اور پائجاموں کی پیمائش کرتے پھرتے ہیں، وہ آخرت پر پورا سچّا اور پکّا ایمان پیدا کرنے سے پہلے لوگوں پر خشیّت تقویٰ، تواضع اور فروتنی کا جمال دیکھنا چاہتے ہیں، ان الٹی کوششوں سے ایک حد تک ڈاڑھیاں لمبی تو ہو جاتی ہیں،

ازاریں اپنی حد کے اندر تو آجاتی ہیں، چلنے پھرنے، اُٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے ہر چیز ہیں ایک مصنوعی مسکینی نمایاں تو ہو جاتی ہے، کھانے پینے، کھانسنے اور چھینکنے ہر چیز ہیں پابندیٔ سنّت کا التزام و اہتمام بظاہر پیدا تو ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ یہ سب کچھ غیر عقلی اور غیر فطری طریقہ پر پیدا کیا جاتا ہے اس وجہ سے اس تمام ہمہ ہمہ تقویٰ کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ: "مچھر چھانے جاتے ہیں اور اونٹ نگلے جاتے ہیں"۔ اس طرح کے اتقیاء یہ نہیں دیکھتے کہ جو لقمہ حلق ہیں جا رہا ہے وہ پاک و طیّب ہے یا طاغوت کی خدمت کر کے حاصل کیا گیا ہے، لیکن اس امر کا انتہائی اہتمام کرتے ہیں کہ اس لقمۂ حرام کو کھانے کے بعد پانی داہنے ہی ہاتھ سے پییں، بائیں ہاتھ سے نہ پییں۔

یہی لوگ ہیں جن کا دینی تصوّر یہ ہے کہ اگر ایک شخص کی "نیت خالص" ہے تو وہ کسی نظامِ باطل کے اندر تھانہ داری، ڈپٹی کمشنری اور کونسلوں کی ممبری سب کچھ کر کے اللہ کو راضی اور اسلام کے جھنڈے کو اونچا کر سکتا ہے۔ ان ہی متقیوں کے اندر ایسے لوگ بھی آپ کو مل جائیں گے جو اپنی خوش قسمتی پر بہت نازاں ہیں کہ انھیں اپنی لڑکی کے لیے ایسا دیندار بر ملا ہے کہ اس کا ازار ٹخنوں سے کبھی نیچے نہیں ہوتا اور "فلاں حضرت" کا مرید ہے۔ لیکن ان کی نظر اس بات پر نہیں جاتی کہ اس نے اپنی معاش کے لیے جو ذریعہ اختیار کیا ہے کوئی مسلمان حسّ ایمانی رکھتے ہوئے اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا۔

یہ سارا بے تکاپن درحقیقت نتیجہ ہے اس بات کا کہ ایک مدّت سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی دعوت نہیں اٹھی جو ان کے سامنے ان کے پورے دین کو اس کے سسٹم کے ساتھ پیش کرتی، اور تبلیغ و دعوت کے ہر مرحلہ میں دین کا جس قدر حصّہ لوگوں کو دیتی اس کے پورے مقتضیات ان پر واضح کر دیتی۔ بلکہ جن لوگوں نے بھی اس سلسلہ میں کوئی کام شروع کیا، اصلی ضرورت کا شعور اور نظامِ دین کی معرفت نہ ہونے کی وجہ سے، جہاں سے چاہا شروع کر دیا اور جہاں چاہا ختم کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ دینی شعور ہے بھی اس

قدر اُلٹا اور بے جان ہے کہ اس کو کسی صحیح دعوت کے لیے بنیاد بنانا تو درکنار اس کو قائم رکھ کر کوئی صحیح دعوت شاید شروع بھی نہیں کی جا سکتی۔

جماعتی استطاعت اب اسی طرح بالاجمال اس اجتماعی استطاعت کی حقیقت پر غور کیجیے، جس کو حضرات انبیائے کرامؑ دین کو پیش کرنے میں ملحوظ رکھتے ہیں، دین کے احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو طرح کے ہیں۔ ایک انفرادی احکام، دوسرے اجتماعی احکام۔ انفرادی احکام افراد کے لیے ہوتے ہیں اور ہر فرد کے لیے اس کی انفرادی حیثیت ہی ہیں، ان کی تعمیل ضروری ہے۔

مثلاً نماز، روزہ، انفاق وغیرہ۔ اجتماعی احکام کا تعلق جماعت سے ہے۔ جب جماعت وجود میں آجائے تو یہ اس کا فرض ہے کہ ان کی تعمیل کرے۔ مثلاً وہ احکام جو معاشرت و سیاست اور جہاد سے متعلق ہیں، پہلی قسم کے احکام کی تعلیم و دعوت میں افراد کے تحمل اور ان کی قوتِ برداشت کا لحاظ ہوتا ہے کہ احکام و قوانین ان پر بارش کی طرح برسا نہ دیے جائیں کہ وہ گھبرا کے سب کچھ چھوڑ بیٹھیں۔ دوسری قسم کے احکام میں جماعت کے تحمل کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس قابل ہے بھی کہ نہیں کہ جو احکام اس کو دیئے جا رہے ہیں ان کا بوجھ سہار سکے۔ اس جماعتی استطاعت کا لحاظ نہایت ضروری بھی ہے، اور اس کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہایت مشکل بھی ہے۔ انبیائے کرامؑ کو تو اس معاملہ میں براہِ راست اللہ تعالےٰ کی طرف سے رہنمائی ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کے اوپر احکام و قوانین نازل ہی جماعت کی قوت و استعداد کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ البتہ جو لوگ انبیاءؑ کے طریقہ پر کسی جماعت کو اٹھانا چاہتے ہوں ان کو اس معاملہ میں سرتاسر اجتہاد سے کام لینا پڑتا ہے اور جب تک انھیں احکام کی ترتیب نزول، اپنے وقت کے خاص حالات اور ایک نبی اور غیر نبی کی جماعت کے فرق کا پورا پورا اندازہ نہ ہو۔ کبھی ان کا قدم صحیح راہ پر نہیں پڑ سکتا، اور ہر وقت اس بات کا اندیشہ ہے کہ جس جماعت کی قیادت وہ کر رہے ہیں اس کی کشتی ساحل پر پہونچنے سے پہلے کسی چٹان

سے ٹکرا کے پاش پاش نہ ہو جائے۔

جو لوگ اس امر سے واقف نہیں ہیں وہ پورے قرآن مجید کو اپنے سامنے رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پورا کا پورا ایک ہی دن میں اُتار دیا گیا تھا۔ اور اس پورے کے پورے کو ایک ہی دن میں جاری و نافذ ہو جانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ ایک طرف توحید کی دعوت شروع کریں گے، دوسری طرف اسلامی نظامِ قضا کی داغ بیل بھی ڈال گے، ایک طرف کفر بالطاغوت کی شرح شروع کریں گے۔ دوسری طرف طاغوت کو الٹی میٹم بھی بھیج دیں گے، ان باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بالکل خبر نہیں ہے کہ کسی سرزمین کے نظامِ جاہلی کو نظامِ اسلامی سے بدل دینے کے لیے جو دعوت اٹھتی ہے اس میں جماعت کی کی اجتماعی قدرت و استطاعت کا کس قدر صحیح اندازہ کر کے قدم اٹھانا پڑتا ہے اور اگر اندازہ میں ادنیٰ غلطی بھی ہو جائے تو کیا خطرے متصوّر ہیں ہ۔

یہاں اس بات کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے کہ قرآن میں معاشرت اور سیاست سے متعلق سارے احکام اس وقت نازل ہوئے ہیں جب کہ دارالاسلام بالفعل قائم ہو چکا ہے اور ان احکام کے نازل ہونے میں بھی ایک ترتیب و تدریج ہے، اور یہ ترتیب و تدریج جماعت کی استطاعت کے بالکل متوازی ہے، جب مسلمان اتنی تعداد میں ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی ایک علیحدہ ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کر سکتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انھیں ایک آزاد گوشۂ زمین بھی مل جاتا ہے تب انھیں نظامِ کفر سے قطع تعلق کا آخری حکم دیا جاتا ہے، اسی طرح جب مسلمانوں کی جماعتی قوّت کم از کم اتنی ہو جاتی ہے کہ وہ کفر کے مقابل میں ٹک سکیں، تب انھیں لڑائی کے لیے تلوار اُٹھانے کا حکم دیا جاتا ہے۔

علیٰ ہٰذالقیاس جب مسلمان اس حیثیت میں ہو جاتے ہیں کہ وہ ایک مستقل نظامِ معاشرت و نظامِ معیشت کو چلا سکیں، تب انھیں نظامِ کفر سے ہر طرح کے معاشرتی قطعِ تعلق کا حکم دیا جاتا ہے، اور اسلام کے وہ قوانین و احکام نازل ہوتے ہیں جو مدنی و

اجتماعی زندگی سے متعلق ہیں، پھر جب مسلمان وہ سیاسی قوت بہم پہونچا لیتے ہیں کہ بغیر کسی اندیشۂ مزاحمت کے خدا کی زمین پر خدا کے احکام کو جاری ونافذ کر سکتے ہیں تب ان کو وہ احکام وقوانین دیئے جاتے ہیں جن کا تعلق بین الاقوامی سیاست سے ہے۔ ایک طالب علم کی ذہنی استعداد کی طرح ایک جماعت کی مادّی استعداد بھی تدریجاً ہی بڑھتی ہے۔ اور جو لوگ کسی جماعت کی قیادت کرتے ہیں ان کو سب سے زیادہ بیدار مغزی کے ساتھ جماعت کی اس استعداد ہی کا اندازہ کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کا صحیح صحیح اندازہ کیے بغیر جماعت پر کوئی بوجھ ڈال دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو استعداد اس نے ایک مدّت میں فراہم کی ہے وہ ساری کی ساری برباد ہو جائے گی۔

اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اشارہ فرمایا ہے:۔

انما نزل اوّل ما نزل	قرآن میں سب سے پہلے جو چیز نازل
منه سورة من المفصل فيها	کی گئی وہ مفصل ایک سورہ ہے
ذكر الجنّة والنّار حتى اذا	جس میں دوزخ اور جنّت کا ذکر ہے
ثاب النّاس الى الاسلام	یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کے
نزل الحلال والحرام ولو نزل	دائرہ میں آگئے، تب حلال وحرام کے
اوّل شئ لا تشربوا الخمر لقالوا	احکام اُترے اور اگر بالکل شروع میں
لا ندع الخمر ابدا ولو نزل	حکم آجاتا کہ شراب نہ پیو، تو لوگ کہتے کہ
لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا	ہم ہرگز شراب نہ چھوڑیں گے اور اگر یہ حکم
ابدا۔	دیا جاتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم ہرگز
(بخاری باب تالیف القرآن)	زنا نہ چھوڑیں گے۔

ا

دعوت کے طریقے

بعض دینی حلقوں میں خدا جانے یہ خیال کہاں سے پھیل گیا ہے کہ تبلیغ کا معیاری اور پیغمبرانہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی ہاتھ میں ایک لٹھیا اور جھولی میں تھوڑے سے چنے لے لے اور تبلیغ کے لیے نکل کھڑا ہو۔ نہ پاؤں میں جوتی ہو نہ سر پر ٹوپی، گاؤں گاؤں پھرے اور جس جگہ کوئی شخص مل جائے خواہ وہ سُنے نہ سُنے، اس پر تبلیغ شروع کر دے۔ اگر کسی شہر میں گزر ہو تو وہاں جس نکڑ یا چوراہے پر چار آدمی نظر آجائیں وہیں تقریر کے لیے کھڑا ہو جائے، ریل میں اسٹیشن پر، بازار میں، سڑک پر جس جگہ کوئی بھیڑ مل جائے وہیں اس کا وعظ شروع ہو جائے۔ ہر مجلس میں گھس جائے، ہر کانفرنس میں اپنی جگہ پیدا کرلے، ہر پلیٹ فارم پر جا دھمکے، سُننے والے تھک جائیں، لیکن وہ سُنانے سے نہ تھکے۔ لوگ اس کے تعاقب سے گھبرا گھبرا جائیں، لیکن وہ خدائی فوجدار بنا ہوا ہر ایک پر مسلّط رہے، لوگ اس کے سوال و جواب کے ڈر سے چھپتے پھریں، بلکہ بسا اوقات آزردہ ہو کر گستاخیاں اور بدتمیزیاں بھی کر بیٹھیں، لیکن وہ اسی جوش و انہماک کے ساتھ اپنا کام جاری رکھے۔ جہاں وعظ کی فرمائش کی جائے وعظ کہہ دے، جہاں میلاد کی خواہش کی جائے میلاد پڑھ دے، اور جہاں مخالفین و منکرین سے سابقہ پڑ جائے وہاں خم ٹھونک کے میدانِ مناظرہ میں بھی اُتر پڑے۔

یہ ہے تبلیغ کا اصلی طریقہ، اور یہ ہے ایک سچے مبلّغ کی صحیح تصویر، جو ہمارے بہت سے دیندار لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ تبلیغ و تعلیم کے موجودہ ترقی یافتہ اور سائنٹیفک

طریقوں کے تھوڑے بہت مفید ہونے کے ممکن ہے یہ لوگ منکر نہ ہوں۔ لیکن خیر و برکت والا طریقہ ان کے نزدیک یہی ہے، جس کو ان کے خیال میں حضرات انبیاء نے اختیار فرمایا۔

ہمارے نزدیک اس طریقہ کو انبیاء کا طریقہ سمجھنا کچھ تو انبیاء کے طریقے سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے، اور کچھ ان حضرات کی اس خواہش کا کہ ان کا اپنا اختیار کیا ہوا طریقہ (جس کے سوا وہ کسی اور طریقہ کو اختیار کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں) ایک محترم و مقدس طریقہ ثابت ہو جائے، انبیاء کے طریقۂ تبلیغ کا جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ ان کے زمانوں کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ اور ترقی یافتہ طریقے تھے اور یہ طریقے حالات کے تغیر اور تمدنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ بدلتے بھی رہے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اس معاملہ میں کسی ایک ہی طریق پر اصرار صحیح نہیں ہے، بلکہ داعیانِ حق کو چاہیے کہ وہ ہر زمانہ میں تبلیغ و تعلیم کے لیے وہ طریقے اختیار کریں جو ان کے زمانوں میں پیدا ہو چکے ہوں اور جن کو اختیار کر کے وہ اپنی کوششوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید اور نتیجہ خیز بنا سکتے ہوں۔

علم کی ترقی کے ساتھ ساتھ دعوت کے طریقوں میں ترقی

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ انبیائے کرام نے تبلیغ کے کام میں جیسا کہ عرض کیا گیا، کسی ایک ہی طریقے پر اصرار نہیں کیا ہے، بلکہ جس رفتار سے دنیا میں علم و فن ترقی کرتا گیا ہے، اسی اعتبار سے ان کی تبلیغ و تعلیم کے طریقے بھی بدلتے گئے ہیں۔ ابتدائی دورِ تمدن میں، جب لکھنے پڑھنے کا فن وجود میں نہیں آیا تھا، انبیاء کی تعلیم و تبلیغ بھی زبانی تھی۔ نیکی اور سچائی کے اصول وہ لوگوں کو زبانی اَگر تلقین کر دیتے اور لوگ ان کو یاد کر لیتے، جو نسلاً بعد نسلٍ، روایات کی شکل میں، ان کے ماننے والوں میں منتقل ہوتے رہتے، یہاں تک کہ جب امتدادِ زمانہ سے وہ اصول فراموش ہو جاتے، یا ان کے اندر دوسری آمیزشیں ہو جاتیں تو اللہ تعالےٰ کسی اور نبی کو بھیجتا، جو اگر

اس تعلیم کو از سرِ نو تازہ کر دیتا۔

جب تک تحریر کا فن ایجاد نہیں ہوا تبلیغ کے معاملہ میں سارا اعتماد صرف شخصی ارتباط، زبانی اظہار و بیان اور سامعین کی قوتِ حافظہ پر رہا۔ لیکن جب انسان نے تحریر کا فن ایجاد کر لیا اور لوگوں تک کسی چیز کے پہنچانے اور اس کو ان کے اندر محفوظ رکھنے کا ایک اور ترقی یافتہ طریقہ پیدا ہو گیا تو انبیائے کرامؑ نے اس کو بھی اختیار فرمالیا۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے زبانی تلقین کے بجائے توریت کے احکام اپنی قوم کو تختیوں پر لکھ کر دیئے۔ اسی طرح عربوں کو دین کی تعلیم قلم (تحریر) کے ذریعہ سے دی گئی اور اللہ تعالےٰ نے ان پر اس بات کا احسان جتایا ہے کہ ان کو صرف زبانی تعلیم کے بجائے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی گئی ہے، جو تعلیم کا ایک اعلیٰ اور محفوظ ترین ذریعہ ہے:

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ	اور تو پڑھ اور تیرا خداوند وہ فیاض
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ	خدا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے
الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۞	تعلیم دی اور انسان کو وہ چیز سکھائی
(۳ - ۵ علق)	جس سے وہ ناآشنا تھا۔

اس آیت سے واضح ہے کہ یہ اللہ تعالےٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے انسان کو قلم کے استعمال کا ڈھنگ سکھایا اور پھر اس کے اس ترقی یافتہ طریقہ کو تعلیم دین کا ذریعہ بنایا۔ جس کی وجہ سے وہ اس لایق ہوا کہ اس کو اللہ تعالےٰ کی سب سے بڑی نعمت، کتاب — بخشی جائے، زبانی تعلیم کے مقابلہ میں قلم اور کتاب کی تعلیم کو جو ترجیح حاصل ہے اور اس میں اتمامِ حجت اور تبلیغِ کامل کے جو پہلو ہیں، ان کی طرف قرآن نے جگہ جگہ اشارات کئے ہیں، لیکن یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے۔ یہاں ہم جس بات کو سامنے لانا چاہتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ انبیاءؑ کا طریقۂ تبلیغ کوئی جامد طریقہ نہیں ہے، بلکہ انسان کی علمی و ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلیاں اور ترقیاں ہوتی رہی ہیں۔ اس سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے

کہ سائنس اور تمدن کی ترقی سے انسان کے وسائل کار اور ذرائع معلومات میں جو اضافے ہوئے ہیں ان سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ فائدہ اُٹھانے کا حق داعیانِ حق کو ہے۔ مثلاً آج پریس، ریڈیو اور سینما وغیرہ نے انسان کے پروپیگنڈہ اور تعلیم و تبلیغ کی قوت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے۔ ایک بڑی سے بڑی تقریر چند منٹوں کے اندر اندر دنیا کے ایک گوشہ سے لے کر دوسرے گوشہ تک پہنچائی جاسکتی ہے۔ کسی وسیع سے وسیع تحریک سے چند دنوں کے اندر اندر دنیا کے تمام پڑھے لکھے انسانوں کو آشنا کیا جاسکتا ہے۔ مشکل سے مشکل باتیں بہت معمولی محنت سے عوام اور خواص سب کے ذہن نشین کرائی جاسکتی ہیں۔ اس زمانہ میں اہلِ باطل ان ہی ذرائع سے کام لے کر اپنے جس باطل کو چاہتے ہیں دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلا دیتے ہیں۔ ان ایجادات نے دنیا کی تمام دوریوں اور تمام فاصلوں کو لپیٹ کر رکھ دیا ہے قوموں اور قوموں کے درمیان اب سمندروں اور پہاڑوں کے پردے کوئی روک نہیں بن سکتے ہیں کل تک ایک اسکول کا ماسٹر جس طرح اپنی بات اپنے سامنے بیٹھے ہوئے بچوں کو سنا سکتا تھا آپ آج چاہیں تو اسی طرح اس پورے کرۂ ارض کے انسانوں کو اپنی بات سُنا سکتے ہیں۔ کل تک جس چیز کی تعلیم پر مہینوں اور سالوں صرف کر کے آپ اس کو ذہنوں میں راسخ نہیں کر سکتے تھے، آج اگر چاہیں تو موجودہ سائنٹیفک ذرائع سے کام لے کر کسی شہر کے عوام و خواص سب کو چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کا عالم بنا دے سکتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہے کہ آج حق کی تبلیغ کے لیے ان ذرائع پر قبضہ کیا جائے۔ اگر اہلِ حق یہ خیال کر کے ان چیزوں کو نظر انداز کر دیں کہ انبیاء نے تبلیغ دین کے کام میں ان چیزوں کو استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ ایک ایک شخص کے پاس پہنچ کر ہی اس پر تبلیغ کی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے لیے بھی اولیٰ یہی ہے کہ ہم ان چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیں، بلکہ گھر گھر پہونچ کر ہی لوگوں کو تبلیغ کریں۔ تو یہ انبیاء کے طریقے کی پیروی نہیں ہوگی، بلکہ یہ شیطان کا ایک بہت بڑا دھوکا ہوگا، جو وہ آپ کو اس لیے دے رہا ہے تاکہ جب تک آپ اپنے "دین دارانہ" طریقہ پر چل کر دو آدمیوں سے کوئی بات کہیں کہیں اس

وقت تک وہ ان سائنٹیفک وسائل سے کام لے کر ہزاروں لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں تک اپنی دعوتِ باطل نہایت مؤثر طریقہ پر پہنچا دے۔

شیطان نے اسی طرح کے دھوکے دے کر اکثر اہلِ حق کی کوششوں اور قابلیتوں کو نقصان پہونچا دیا ہے اور ان کے مقابل میں خود اپنا پلّہ بھاری رکھا ہے۔ یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اب زندگی کے ہر میدان میں یہ پیچھے ہو گئے ہیں اور وہ آگے آگے قوموں کی امامت کر رہا ہے اور دونوں کی کوششوں کے نتائج میں سرے سے کوئی نسبت ہی باقی نہیں رہ گئی ہے اور یہی صورتِ حال اس وقت تک باقی رہے گی جب تک اہلِ حق ان زبردست قوتوں کو حق کی خدمت میں استعمال کرنے کا ڈھنگ نہ سیکھ جائیں جو آج سو فیصدی شیطان کے تصرف میں ہونے کی وجہ سے یکسر باطل کی خدمت میں صرف ہو رہی ہیں۔

اجتماعی ترقیوں سے استفادہ

دعوت کا طریقہ جس طرح سائنٹیفک نقطۂ نظر سے بہت اعلیٰ اور ترقی یافتہ ہونا چاہیئے، تاکہ باطل سے پوری قوت کے ساتھ مقابلہ ہو سکے، اسی طرح معاشرتی اور اجتماعی پہلو سے زندگی میں جو ترقیاں ہو چکی ہیں ان سے بھی اس سلسلہ میں پورا فائدہ اٹھانا چاہیے تاکہ دعوت، وقت کے معیار کے لحاظ سے پوری طرح باوقار ہو، اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ سوسائٹی کے اندر آپس میں مل بیٹھنے، باہم دگر تبادلۂ خیالات کرنے، اپنے خیالات کو سُنانے اور دوسروں کے خیالات کے سُننے، کسی امر کو اجتماعی طور پر طے کرنے کے جو طریقے رواج پا چکے ہیں، اگر ان میں کوئی اخلاقی و شرعی قباحت نہیں ہے، تو اہلِ حق ان کو اپنائیں اور تبلیغِ حق میں ان سے کام لیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان تمام طریقوں سے فائدہ اُٹھایا جو اس عہد کی معاشرت اور اجتماعی زندگی میں نشو و نما پا چکے تھے اور دعوت کے نقطۂ نظر سے کارآمد تھے۔ اوّل اوّل جب آپؐ نے اپنے خاندان کے لیڈروں کو ــــــ جو درحقیقت قوم کے بھی لیڈر تھے، اپنے مقصد سے آگاہ کرنا چاہا تو اس کے لیے طریقہ یہ اختیار فرمایا کہ حضرت

علیؓ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کریں اور تمام خاندانِ مطّلب کو کھانے پر بلائیں۔ حضرت علیؓ نے اس حکم کی تعمیل کی۔ پورا خاندانِ مطّلب جمع ہوا۔ حضرت حمزہؓ، ابوطالب اور عباسؓ سب لوگ دعوت میں شریک ہوئے، جب لوگ کھانا کھا چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر ایک تقریر فرمائی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ:

"میں آپ لوگوں کے پاس ایک ایسی چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی سعادت کی کفیل ہے"۔

پھر آخر میں حاضرین سے سوال فرمایا کہ:

"اس بارِ گراں کو اُٹھانے میں آپ میں سے کون میرا ساتھ دینے کے لیے تیار ہے؟"۔

اس سوال پر سب لوگ خاموش رہے، تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد حضرت علیؓ نے ایک گوشہ سے اُٹھ کر نہایت مؤثر الفاظ میں فرمایا کہ:

"گو مجھے آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں، اور گو میں سب میں نوعمر ہوں، تاہم میں آپؐ کا ساتھ دوں گا"۔

اس طریقہ کے علاوہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے عام طریقے بھی اختیار فرمائے جو دعوت کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔ مثلاً مکّہ اور طائف کے سرداروں سے ملنے اور ان کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے خود تشریف لے جاتے، حج کے زمانے میں جو قبیلے مکّہ کے آس پاس آ کے ٹھہر جاتے، آپؐ اُن کے سرداروں سے ملتے اور ان کو دعوتِ اسلام دیتے، بعض مقامات پر یا بعض خاص خاص لوگوں کے پاس اپنے نمائندے بھی بھیجتے۔ عرب میں کچھ موسمی بازار لگتے تھے، جن میں ہر طبقہ کے لوگ جمع ہو جایا کرتے تھے، اور یہ بازار صرف خرید و فروخت اور کھیل تماشوں ہی کے بازار نہ تھے، بلکہ وقت کے معیار کے لحاظ سے ان میں علمی اور ادبی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں۔ آپؐ ان بازاروں میں

بھی تشریف لے جاتے اور لوگوں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنے کے موقعے پیدا کرتے۔ بہت سے لوگوں کو آپؐ نے خطوط کے ذریعے سے بھی دعوت دی۔ غرض اس زمانہ میں لوگوں کو کسی چیز سے قریب کرنے یا لوگوں سے قریب ہونے کے جو طریقے پیدا ہو چکے تھے، اگر ان میں کوئی اخلاقی خرابی نہیں تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے کام میں ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔

ہر عہد میں لوگ اُن ہی طریقوں سے مانوس ہوتے ہیں جو اس عہد کی تمدنی و اجتماعی زندگی میں رواج پا چکے ہوتے ہیں، اس وجہ سے ضروری ہوتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ان ہی طریقوں کو اختیار کیا جائے جو ان کے مزاج اور حالات کے مناسب ہیں۔ جس طرح لوگ ملتے ہیں اسی طرح ان سے ملا جائے، جس طرح لوگ کسی بات کو سنتے ہیں، اسی طرح اُن کو سُنانے کی کوشش کی جائے۔ جس طریقۂ کار کو لوگ باوقار سمجھتے ہیں اسی طریقِ کار کو اختیار کیا جائے۔ اگر ایک داعی ——— بالخصوص ایک داعیٔ حق ——— ان طریقوں کے اختیار کرنے سے محض اس وجہ سے گریز کرے کہ یہ طریقے اس کے اپنے مذاق کے خلاف ہیں، یا وہ ان کو اختیار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا، یا ان طریقوں پر قدامت کی مہر نہیں لگی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے ان کے خیال میں وہ معیاری نہیں ہیں، تو ان باتوں کا لازمی نتیجہ اس کی دعوت کی ناکامی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اور اس کے اخلاصِ نیت کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی اس کی دعوت کو اس انجام بد سے نہ بچا سکے گی۔ اگر ایک شخص آج دعوتِ دین کے لیے یورپ یا امریکہ کے کسی ملک میں جائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں سے اپنا ربط بڑھانے اور ان کے اندر اپنے خیالات پھیلانے کے وہی ذرائع اور وہی طریقے اختیار کرے جو وہاں کی اجتماعی اور تمدنی زندگی میں رواج پا چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا یا نہیں کرنا چاہتا بلکہ مصر ہے کہ وہ سڑکوں پر چل پھر کر ہی لوگوں کو کلمہ اور نماز سکھائے گا، تو خواہ یہ شخص کتنا ہی مخلص ہو لیکن وہ اپنے اس بے ڈھنگے پن سے

اپنی محنت بھی رائیگاں کرے گا اور کلمہ اور نماز کی عزت بھی خاک میں ملائے گا۔

اس سلسلہ میں ایک داعئ حق کی احتیاط صرف اس حد تک ہونی چاہیے کہ وقت کے مقبول اور رائج طریقوں میں سے وہ ان طریقوں کو نہ اختیار کرے جن میں اخلاقی پہلو سے کوئی خرابی ہو اور اگر اس طرح کا کوئی طریقہ کسی خاص ضرورت سے اختیار کرنا ہی پڑ جائے تو ضروری ہے کہ اس کو اس اخلاقی بُرائی سے پاک کر کے اختیار کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل اوّل اوّل اپنی قوم کو غفلت سے بیدار کرنے اور لوگوں کو اپنی بات کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوہِ صفا پر چڑھ کر جو نعرہ لگایا اس کی اصلی شکل عرب جاہلیت میں یہ تھی کہ خطرہ کی شدّت کا اظہار کرنے کے لیے نعرہ لگانے والا اپنے سارے کپڑے اُتار کر بالکل ننگا ہو جایا کرتا تھا۔ چنانچہ عربی میں اس کو "النَّذِیرُ العُریَان" نذیر عریاں بھی کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو چوکنّا کرنے کا طریقہ تو وہی اختیار فرمایا جو ایک نذیر عریاں کا ہوتا تھا، لیکن ننگے ہو جانا چونکہ ایک سخت قسم کی بے حیائی اور بداخلاقی تھی اس وجہ سے آپؐ نے اس بُرائی سے اس طریقہ کو پاک کر لیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو مجلسی اور اجتماعی طریقے پیدا ہو چکے ہیں ان میں اگر کوئی پہلو بُرائی کا ہے تو اس بُرائی کی وجہ سے ان کو یک قلم رد کر دینا ضروری نہیں ہے۔ کرنا صرف یہ چاہیئے کہ ان طریقوں کو بُرائیوں سے پاک کر کے ان کو مقصدِ حق کے لیے استعمال کیا جائے۔

آج متمدّن ملکوں میں کسی تحریک کو لوگوں کے اندر پھیلانے کے جو بے شمار طریقے پیدا ہو چکے ہیں وہ جس طرح برائیوں کو پھیلانے میں کارآمد ہیں۔ اسی طرح بھلائیوں کے پھیلانے میں بھی نہایت کارآمد ہو سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ برائیوں سے بچ کر ان سے فائدہ اُٹھایا جائے، لیکن مشکل یہ ہے کہ آج جو لوگ ان کو اختیار کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر مقاصد کے لیے بھی ان کو بدتر سے بدتر بنا کر استعمال کرتے ہیں، جہاد

جیسے مقدس مقصد کے لیے اگر روپیہ جمع کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے مینا بازار لگائیں گے اور اس میں حُسن فروشی اور بے حیائی کو جلبِ زر کا ذریعہ بنائیں گے۔

مہاجرین کی امداد جیسے اعلیٰ اور برتر کام کے لیے اگر فنڈ قائم کرنا چاہیں گے تو رقص و سرود اور پیانو نوازی کی مجلسیں منعقد کریں گے اور ناچ و رنگ اور غمزہ و عشوہ کے ذریعہ سے مسلمانوں کے جذبۂ انفاق کو حرکت میں لائیں گے۔ ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر تحریک جذبات کے لیے کوئی اور محرک نہیں ملے گا، تو کچھ شعراء حضرات کی خدمات حاصل کر کے ان ہی کو آمادہ کریں گے کہ کچھ وہی اپنی نغمہ طرازیوں اور مجلس آرائیوں سے دلوں کو گرمائیں اور لوگوں کے ایمان کو بیدار کریں۔ قوم کے فسادِ مذاق کی وجہ سے جن چیزوں کے اندر بھلائی کا کوئی پہلو موجود ہوتا بھی ہے وہ بھی بُرائی کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں اس بات کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے کہ یہ کسی بُرائی کو مٹا کر اس کی جگہ کسی بھلائی کو لائیں گے۔ تاہم اسلام کی تعلیم یہی ہے کہ جن چیزوں کے اندر کوئی پہلو برائی کا ہے ان کی اس بُرائی کی اصلاح کر کے مقصدِ حق کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ان کو یک قلم نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔

یہ دو اصولی ہدائتیں ان طریقوں سے متعلق لحاظ رکھنے کی ہیں جو ایک داعیٔ حق کو اپنی دعوت کے سلسلہ میں اختیار کرنے ہیں۔ اب بعض ہدایتیں ان طریقوں سے متعلق ہم ذکر کریں گے جن سے بہر حال ایک داعیٔ حق کو احتراز کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ داعی کو کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو دعوت یا داعی کے وقار یا دعوت کے مفاد کے خلاف ہو۔ ایسی باتیں جو دعوت یا داعی کے وقار یا دعوت کے مفاد کے خلاف ہوں، بہت سی ہو سکتی ہیں۔ ان سب کو گنانا بہت مشکل ہے۔ صرف بعض باتیں ہم بطور مثال ذکر کریں گے۔ جن سے فی الجملہ اندازہ ہو سکے گا کہ داعیانِ حق کو کسی قسم کے طریقوں سے بچنا چاہیے۔

خلافِ وقار طریقوں سے احتراز

ایک داعیٔ حق کو اپنی دعوت کی طرف لوگوں کو مائل کرنے کے ان تمام طریقوں سے بچنا چاہیے، جن سے دعوت کی شان یا خود داعی کے وقار کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو، اپنے کام میں غیر معمولی انہماک اور لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کی زیادہ سے زیادہ خواہش ایک داعی کی بہترین خصوصیت ہے۔ لیکن اس انہماک اور اس خواہش کو اتنا نہیں بڑھ جانا چاہیے کہ نہ داعی کو اپنے نفس کے حقوق کا کچھ ہوش باقی رہ جائے، نہ اپنے ساتھیوں اور دوستو کا کچھ خیال باقی رہے۔ اور نہ ہی اپنی دعوت کے مرتبہ و مقام ہی کی کچھ ایسی پرواہ رہ جائے جو سُننا نہیں چاہتے ان کو سُنانے کے درپے ہونا۔ بھاگنے والوں کے پیچھے پڑنا، نفرت کرنے والوں کو پرچانا، اور گھمنڈ کرنے والوں کی تواضع کرنا، بس وہیں تک جائز ہے کہ داعی کی خودداری اور دعوت کی عظمت کو کوئی نقصان نہ پہنچے، اور نہ دعوت کے کام میں کوئی پہلو ابتذال اور اوچھے پن کا پیدا ہونے پائے، اگر معاملہ اس حد سے آگے بڑھتا نظر آئے تو جس حق کی محبت داعی کو ان تمام نیاز مندیوں پر مجبور کر رہی ہے اسی حق کے احترام کا تقاضا ہے کہ وہ پوری خودداری کے ساتھ ایسے لوگوں سے الگ ہو جائے، اور صرف ان لوگوں کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے جن میں حق کی طلب اور علم کی پیاس موجود ہے۔

سورۂ عبس کی مندرجہ ذیل آیتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قریش کے لیڈروں کے ساتھ اسی طرح کی نیاز مندیوں سے روکا گیا ہے اور اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جس بلند رتبہ دعوت کو لے کر تم اُٹھے ہو وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو اس قدر جُھک کر پیش کیا جائے۔ ان آیات میں قرآن کی عظمت اور اس کے مرتبہ کی بلندی کا ذکر اسی مقصد سے کیا گیا ہے، کہ یہ بلند مرتبہ کلام جس کسی کے آگے بھی پیش کیا جائے اس کو پیش کرتے وقت اس کے مرتبہ کا لحاظ رہے کہ یہ خدا کا فرمان ہے، کسی سائل کی درخواست نہیں ہے:

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ۙ فَأَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى ۗ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكّٰى ۗ وَأَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ۙ وَهُوَ يَخْشٰى ۙ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ۚ كَلَّآ إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۘ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ بِأَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۙ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۗ

(عبس ۵، ۶)

لیکن جو بے پروائی برتتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو، حالانکہ تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اگر وہ اپنے آپ کو نہ سدھارے اور وہ جو تمہارے پاس شوق سے آتا ہے اور اپنے خداوند سے ڈرتا بھی ہے، تو تم اس سے بے پروائی برتتے ہو، ہرگز نہیں، یہ تو بس ایک یاددہانی ہے سو جو شخص چاہے اس سے فائدہ اٹھائے، معزز، بلند رتبہ اور پاکیزہ صحیفوں میں، گرامی قدر اور باوقار منشیوں کے ہاتھ میں۔

تبلیغ کے جوش میں یہ بات جائز نہیں ہے کہ آدمی جس مجلس میں چاہے جا دھمکے، اور کوئی متوجہ ہو یا نہ ہو لیکن وہ اپنی بات سنائے بغیر نہ ٹلے اور نہ یہ بات جائز ہے کہ چمٹنے والے گداگروں کی طرح جو راہ گیر مل جائے اس کے پیچھے پڑ جائے، اور جب تک اس کو کچھ سُنا نہ لے یا اس سے کچھ سُن نہ لے اس وقت تک اس کا پیچھا نہ چھوڑے۔ حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت ہے کہ:۔

وَلَا أُلْفِيَنَّكَ تَأْتِي الْقَوْمَ وَهُمْ فِي حَدِيثٍ مِنْ حَدِيثِهِمْ فَتَقُصُّ عَلَيْهِمْ وَلَكِنْ أَنْصِتْ فَإِذَا أَمَرُوكَ فَحَدِّثْهُمْ وَهُمْ يَشْتَهُونَهُ۔

(بخاری)

میں تمہیں اس حال میں نہ دیکھوں کہ تم کسی جماعت کے پاس جاؤ اور وہ لوگ اپنے کسی اور کام میں مشغول ہوں اور اسی حال میں تم ان کو اپنا وعظ سُنانا شروع کردو بلکہ تمہیں چاہیے کہ تم خاموش رہو، اور جب لوگ فرمائش کریں تو ان کو سناؤ اور وہ خواہش سے سُنیں۔

کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنے سے سخت احتراز کرنا چاہیے جس سے دعوت لوگوں پر بوجھ بن جائے اور وہ اس سے گھبرانے لگ جائیں:

عن شقیق قال کان عبد اللہ	شقیق سے روایت ہے کہ عبداللہ
بن مَسْعُود یُذَکِّرُ الناس	بن مسعودؓ لوگوں کو ہر جمعرات کو وعظ سنایا
فی کل خمیس فقال لہ رجل یا ابا	کرتے تھے، ایک شخص نے ان سے کہا:
عبد الرحمٰن لوددت انك ذکرتنا	"اے ابوعبدالرحمٰن میری خواہش ہے کہ
فی کل یوم قال اما انہ یمنعنی	آپ روزانہ وعظ کہا کریں"۔ انھوں نے
من ذٰلك انی اکرہ ان املکم	کہا میں ایسا اس وجہ سے نہیں کرتا کہ کہیں
وانی اتخولکم بالموعظۃ کما کان	تم پر بوجھ نہ بن جاؤں میں بھی اسی طرح ناغہ
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم	کرکے تمہیں نصیحت سناتا ہوں جس طرح
یتخولنا بہا مخافۃ السامۃ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو ناغہ
علینا۔	کرکے نصیحت سنایا کرتے تھے کہ ہم بیزار
(بخاری)	نہ ہو جائیں۔

مخالفِ مقصد طریقوں سے احتراز

داعیِ حق کو کبھی کوئی ایسا طریقہ نہیں اختیار کرنا چاہیے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے دعوت کے مقصد کے بالکل منافی ہو۔ مثلاً مناظرہ کا طریقہ۔ یہ طریقہ اگرچہ ایک مدت سے دعوت و تبلیغ کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ خیال کیا جاتا ہے، اور اس کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہمارے اہلِ فن نے اس پر کتابیں بھی لکھ ڈالی ہیں، جو ہمارے عربی مدرسوں میں پڑھائی بھی جاتی ہیں، لیکن دعوتِ حق کی روح سے جس قدر بعید طریقہ یہ ہے اس قدر بعید کوئی اور طریقہ ہو نہیں سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مجادلہ اور محاجہ کی اجازت دی ہے، لیکن ان لفظوں کا مفہوم یہ مناظرہ سمجھ لینا، جس کی تعلیم ہماری دینی درس گاہوں میں دی جاتی

ہے، اور جس کے اکھاڑے آئے دن ہمارے مبلغین اور مناظرین جماتے رہتے ہیں۔ بالکل غلط ہے، چونکہ ہمارے اہلِ مناظرہ کا زیادہ تر استدلال قرآن مجید کے ان ہی دو لفظوں سے ہے، اس وجہ سے ہم مختصراً ان دونوں لفظوں کا مفہوم قرآن سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے، تاکہ انبیاء کے مجادلہ اور محاجہ اور مروجہ مناظرہ کا فرق واضح ہو سکے۔

قرآن نے کس مجادلہ کی اجازت دی ہے

قرآن شریف میں دو طرح کے مجادلہ کا ذکر آتا ہے۔

ایک مجادلۂ باطل، دوسرا مجادلۂ حسن، مجادلۂ باطل کو قرآن نے کفار اور معاندین کی طرف منسوب کیا ہے، اور اس کی خصوصیات تقریباً وہی بیان کی ہیں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں میں پائی جاتی ہیں ——— وہی اپنی بات پر بلا کسی دلیل معقول کے اصرار، وہی غیر متعلق باتوں میں اصل مسئلہ کو الجھانے کی خواہش، وہی بے فائدہ کج بحثیوں میں تضیع وقت، وہی اپنے حریف کی بات کو نہ خود سننا نہ کسی کو سننے دینا۔ وہی لایعنی قسم کی موشگافیاں اور بے نتیجہ زبان درازیاں جو عام طور پر اس زمانہ کے مناظروں کی خصوصیات میں شامل ہیں۔ وہی قرآن نے مجادلۂ باطل کی خصوصیات بھی بتائی ہیں اور اہلِ حق کو نہایت سختی کے ساتھ ان سے روکا ہے، اور صرف احسن طریقہ سے مجادلہ کی اجازت دی ہے اور اس احسن طریقہ کی وضاحت علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے خود کر دی ہے، تاکہ اس کو ہر شخص اچھی طرح سمجھ جائے۔

اس کا علمی طریقہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ مخاطب سے لڑائی کرنے کے بجائے اس بات کی کوشش کی جائے کہ جن اصولوں میں اس کے ساتھ اشتراک و اتحاد ہے، اور جن کو تسلیم کرنے سے اس کو انکار نہیں ہے، ان کو اس کے سامنے واضح کیا جائے تاکہ وہ داعی کی بات سننے کی طرف راغب ہو، اور پھر اس کے سامنے ان نتائج کو رکھا جائے، جو اس کے اپنے اقرار کردہ اصولوں سے لازمی طور پر نکلتے ہیں، تاکہ وہ ان کو اپنی بات سمجھ کر

قبول کرنے کی طرف مائل ہو، اپنے حریف کا دعویٰ سمجھ کر اس کی تردید کا جذبہ اس کے اندر نہ پیدا ہو۔ اس کی نہایت عمدہ مثال بھی قرآن نے خود پیش کر دی ہے:

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَاُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَاِلٰهُنَا وَاِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔ (۴۶، عنکبوت)	اور نہ مناظرہ کرو اہلِ کتاب سے مگر اس طریق سے جو بہتر ہے اور جنہوں نے ان میں سے اپنے اوپر ظلم کیا ہے ان کو تو سرے سے مُنہ ہی نہ لگاؤ اور کہو کہ ہم ایمان لاتے ہیں اس چیز پر جو ہماری طرف اتاری گئی اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف اُتاری گئی ہے اور ہمارا تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

اس آیت میں پہلے تو یہ بات واضح کر دی کہ جو شریر اور مفسد لوگ ہیں جو صرف جھگڑنا چاہتے ہیں اور حق کو سمجھنے اور ماننے کا کوئی جذبہ اپنے اندر نہیں رکھتے ہیں ان کو سرے سے منہ ہی نہ لگایا جائے۔ البتہ جو حق کے طالب ہیں ان سے گفتگو کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ آغازِ گفتگو ان اصولوں سے کیا جائے جو ہمارے اور ان کے درمیان مسلّم ہیں۔

اسی اصول کے مطابق اہلِ کتاب کے سامنے توحید کی دعوت ایسے الفاظ میں پیش کی گئی ہے جس سے واضح ہو رہا ہے کہ جب اہلِ ایمان اور اہلِ کتاب میں توحید ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے مسلّم ہے تو پھر اس کے نتائج اور مقتضیات میں باہم کوئی اختلاف کیوں ہو۔ جب اہلِ کتاب نے اس اصل کو مان رکھا ہے تو چاہیے کہ ان لازمی نتائج کو بھی تسلیم کریں جو اس سے نکلتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ	کہہ دو اے اہلِ کتاب آؤ اس بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلّم ہے

اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۞ (۶۴ - آل عمران)	وہ یہ کہ ہم نہ بندگی کریں مگر اللہ کی اور نہ بنائیں کسی چیز کو اس کا ساتھی اور نہ بنائے ہم میں سے کوئی کسی کو رب اللہ کے سوا پس اگر وہ اس کے مقتضیات سے اعراض کریں تو اعلان کردو کہ گواہ رہو کہ ہم اللہ ہی کے فرماں بردار ہیں ۔

قرآن نے مجادلہ کی عملی مثالیں جو نقل کی ہیں اور جن کی تعریف فرمائی ہے ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مجادلہ درحقیقت نام ہے اس بات کا کہ اپنی بات منوانے کے لیے مخاطب پر محبت، اعتماد، حسنِ اخلاق اور حسنِ استدلال سے گھیرے ڈالے جائیں۔ یہاں تک کہ وہ داعی کی دل سوزی، اس کی بے لوثی اور اس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس کی بات کی صداقت پر غور کرنے اور اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو جائے۔

قرآن نے اس طرح کے متعدد مجادلے نقل کئے ہیں، جن کی تفصیل میں طوالت ہے۔ ہم صرف ایک مجادلہ بطور مثال ذکر کریں گے، تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کس طرح کے پُرمحبت اصرار و اظہار کو مجادلہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے، اور اس کی تعریف کی گئی ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قومِ لوطؑ کے بارے میں اللہ تعالیٰ سے جو مجادلہ کیا ہے، قرآن نے اس کی تعریف فرمائی ہے کہ یہ مجادلہ ابراہیمؑ کی دردمندی اور دل سوزی کا نتیجہ تھا، اب دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مجادلہ کی، جس کی قرآن نے تعریف فرمائی ہے، تفصیلی صورت کیا تھی۔ قرآن مجید میں صرف اس کی تعریف کی گئی ہے، اس کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کی تفصیل توریت سے لے رہے ہیں۔ توریت کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیمؑ نے ان فرشتوں سے جو قوم لوطؑ کے لیے عذاب لے کر آئے تھے مندرجہ ذیل گفتگو فرمائی :-

تب ابرہام نے نزدیک جا کر کہا " کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا؟ شاید اس شہر میں پچاس راست باز ہوں، کیا تو اسے ہلاک کرے گا۔ ان پچاس راست بازوں کی خاطر، جو اس میں ہوں، اس مقام کو نہ چھوڑے گا؟ ایسا کرنا تو تجھ سے بعید ہے کہ نیک کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں، یہ تجھ سے بعید ہے، کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا؟" اور خداوند نے فرمایا کہ " اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر ۵۰ راست باز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا "۔

تب ابرہام نے جواب دیا اور کہا کہ " دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں، شاید پچاس راست بازوں میں پانچ کم ہوں کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کرے گا؟" اس نے کہا " اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہیں کروں گا "۔ پھر اس نے اس سے کہا شاید وہاں چالیس ملیں"۔ تب اس نے کہا " میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہیں کروں گا"۔ اس نے کہا " اگر وہاں مجھے تیس بھی ملیں تو بھی میں ایسا نہیں کروں گا"۔ اس نے کہا " دیکھئے! میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی، شاید وہاں بیس ملیں "۔ اس نے کہا " میں اسے بیس کی خاطر بھی نیست و نابود نہیں کروں گا"۔ تب اس نے کہا " اگر خداوند ناراض نہ ہو تو میں ایک بار اور کچھ عرض کروں۔ شاید وہاں دس ملیں"۔ اس نے کہا " دس کی خاطر بھی اسے نیست نہیں کروں گا "۔ جب خداوند ابرہام سے باتیں کر چکا تو چلا گیا اور ابرہام اپنے مکان کو لوٹا "۔

(پیدائش ۱۸ باب ۲۳-۳۳)

یہ طرزِ کلام، یہ طرزِ تخاطب، یہ طرزِ استدلال اور پُر محبت اصرار کا یہ انداز ہے جس کو قرآن نے مجادلہ سے تعبیر کیا ہے، اور یہ مجادلہ ہے جس کی قرآن حکیم نے تعریف فرمائی ہے۔

اگر لوگ اسی مجادلہ کو اپنے مناظروں کے جواز کی دلیل ٹھہراتے ہیں تو چاہئے کہ جو روح اس مجادلہ کے اندر ہے، وہی رُوح اپنے مناظروں کے اندر پیدا کریں اور اسی لطف و محبّت اور اسی دل سوزی و دردمندی کے ساتھ اپنی بات مخاطب کے سامنے پیش کریں نہ کہ سارا اہتمام تو رزم و پیکار اور جنگ و قتال کا ہو اور نام اس کا رکھ لیا جائے مناظرہ، اور اس کے جواز کی دلیل لائی جائے انبیاءؑ کی زندگی سے!۔

اسی طرح قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ایک اور مناظرہ بھی نقل کیا ہے، جس کو محاجّہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مناظرہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کے زمانہ کے ایک بادشاہ کے درمیان ہوا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بادشاہ سے فرمایا کہ "میرا رب وہ ہے جو مارتا اور جِلاتا ہے"۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے کہا کہ: "میں مارتا اور جِلاتا ہوں"۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ "میرا پروردگار سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اس کو مغرب سے نکال۔" اس مناظرہ کو اگر موجودہ فنِ مناظرہ کے ان اصولوں پر پرکھا جائے جن کی تعلیم ہماری مناظرہ کی کتابوں میں دی جاتی ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ اچھے مناظر ثابت نہ ہوں گے۔ کیونکہ وہ بادشاہ کے اس قول پر کہ "میں مارتا ہوں اور جِلاتا ہوں"۔ بہت کچھ معارضہ کر سکتے تھے جو انھوں نے نہیں کیا، حالانکہ ایک مناظر کی حیثیت سے یہی مقام ان کے مورچہ لگانے کا تھا، لیکن انھوں نے ایک مناظر کے اصولِ جنگ کے بالکل خلاف اس نقطہ سے از خود پسپائی اختیار کی اور جوں ہی محسوس فرمایا کہ یہ شخص مناظرہ اور اپنی بات کی پچ کرنے پر تُل گیا ہے، وہ ایک مُسکت بات کہہ کر فوراً علیحدہ ہو گئے، جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر داعی حق کو مخاطب کے متعلق یہ اندازہ ہو جائے کہ یہ بات کو سننا اور سمجھنا نہیں چاہتا، بلکہ معارضہ اور مناظرہ پر اُتر آیا ہے تو اس کے درپے نہیں ہونا چاہئے بلکہ گفتگو کو ختم کر دینا چاہیے ؞

دعوت کی زبان اور داعیانِ حق کا طرزِ کلام

اب ہم بعض باتیں دعوت کی زبان اور انبیاءؑ کے طرزِ کلام سے متعلق بیان کریں گے۔

ایک داعی کا مقصد مجرّد ایک حقیقت کو ظاہر کر دینا ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جائے تاکہ خواص بھی اس کو اچھی سمجھ لیں اور عوام کے لیے بھی اس کے سمجھنے میں کوئی دقت باقی نہ رہ جائے۔ نیز یہ کہ وہ حقیقت نہایت خوبصورت طریق پر ظاہر ہو تاکہ سننے والوں میں سے جن کے دلوں میں قبولِ حق کی کچھ بھی صلاحیت ہے وہ اس کو قبول کر لیں، اور اعراض کرنے والوں کے اعراض کے لیے ان کی بد ذوقی اور ہٹ دھرمی کے سوا اور کوئی وجہ باقی نہ رہ جائے۔ اس مقصد کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دعوت کی زبان مؤثر اور داعی کا طرزِ کلام فطری اور دل نشین ہو، لیکن تاثیر اور کشش پیدا کرنے کے بہت سے مصنوعی اور غیر فطری طریقے بھی ہیں، جن سے کلام میں ایک ظاہری کشش اور دل فریبی پیدا کی جا سکتی ہے۔

مثلاً عرب جاہلیت میں کاہن لوگ سجع آرائی اور قافیہ پیمائی سے اپنے کلام میں شان پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خطباء اپنی لفاظی اور آتش بیانی سے اپنے کلام کے زور و اثر کو بڑھاتے تھے، شعراء اپنی مبالغہ آرائی اور رندی و ہوسناکی کی دعوت سے لوگوں

کو وجد میں لاتے تھے۔ اسی طرح اِس زمانہ میں واعظ اور خطیب شعروں اور قصّوں کی مدد سے اپنے کلام میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اخبار نویس اور سیاسی مقررین جھوٹ اور مبالغہ سے اپنی دوکان چلاتے ہیں۔ اشتہاری دوا فروش جھوٹی قسموں سے اپنا اعتبار بڑھاتے ہیں۔ ان چیزوں سے کلام میں ایک اثر تو ضرور پیدا ہو جایا کرتا ہے، لیکن ان کی حقیقت جھوٹے ملمع سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے جو لوگ دنیا میں حق کی دعوت کے لیے اٹھتے ہیں، نہ تو یہ بات ان کے شایانِ شان ہے کہ اِن مُزخرف چیزوں سے اپنی دعوت کی رونق بڑھائیں، اور نہ وہ اپنی زبان اور اپنے کلام کو ان چیزوں میں سے کسی چیز سے آلودہ ہی کریں۔ ان جھوٹی اور نمائشی چیزوں کی جگہ وہ اس مقصد کے لیے دوسری چیزیں اختیار کرتے ہیں، جو نہ صرف یہ کہ جائز اور صحیح ہیں۔ بلکہ فطرتِ انسانی کے ساتھ وہ گہری مناسبت بھی رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے ان سے جو اثر پیدا ہوتا ہے وہ جھوٹے ملمعوں کی طرح ایک ہی رگڑ میں اُڑ نہیں جایا کرتا بلکہ امتحان کی بھٹیوں میں تپنے کے بعد اس کا جوہر اور زیادہ نکھر کے سامنے آتا ہے۔

داعی کے کام کی نوعیت یہ بات کہ دعوت کا کام صرف اُس طرز کے کلام سے نہیں چل سکتا جو علمی اور مجلسی قسم کی بحثوں کے لیے موزوں ہے، اس قدر واضح ہے کہ اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک داعی کا کام واقعات کی روایات کرنے والے مؤرخ، قانون کی دفعات مرتّب کرنے والے مقنن اور فلسفہ و ریاضی کے مسائل بیان کرنے والے ایک فلسفی اور عالمِ ریاضی سے بالکل مختلف ہے، ایک طرف تو اس کا موضوع اتنا وسیع ہوتا ہے کہ ساری انسانی زندگی اس کے تحت آجاتی ہے دوسری طرف اس کے مخاطب طبیعت و مزاج کے لحاظ سے بھی مختلف ہوتے ہیں اور ذہن و ادراک کے اعتبار سے بھی متفاوت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنے مشن کے ساتھ اس کا لگاؤ بھی اس طرح کا نہیں ہوا کرتا جس طرح کا لگاؤ ایک مجلسی مضمون نگار کو اپنے مضمون یا ایک وکیل کو اپنے

مقدمہ کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ وہ اس کے لیے زندگی اور موت کا سودا ہوتا ہے، اور اس کی تکمیل کے لیے اسے جی جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔ ایسی حالت میں نہ تو وہ اتنی بات پر قانع ہی ہو سکتا ہے کہ جو بات اسے کہنی ہے کسی نہ کسی طرح ایک مرتبہ کہہ ڈالے، اور نہ اتنے سے اس کا کام ہی بن سکتا ہے۔ بلکہ لازماً اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ جس بات کو بھی کہے ایسی وضاحت وخوبی کے ساتھ کہے کہ اس کا کوئی پہلو بھی کنجلک نہ رہ جائے اور ایسے مؤثر اور دل نشین انداز میں پیش کرے کہ جس دل کے اندر سماعتِ حق کی ادنیٰ صلاحیت بھی ہو اس میں گھر کر جائے۔

چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالےٰ سے یہ دعا فرمائی کہ: رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي۔

(اے میرے پروردگار، میرے سینے کو کھول دے، میرے کام کو (دعوتِ حق کے کام کو) آسان کر، اور میری زبان کی گرہ کھول دے کہ لوگ میری بات اچھی طرح سمجھ لیں)۔

نیز حضرت ہارونؑ کے لیے دعا فرمائی کہ:

"ان کو میرے اس کام میں شریک کر دے، تاکہ ان کی زبان آوری میرے نقص گویائی کی تلافی کر سکے اور یہ دعوت کا کام جو میرے سپرد کیا گیا ہے ناتمام نہ رہ جائے"۔

داعیانِ حق کے کلام کی خصوصیات

اب ہم بالاختصار ان چیزوں کی طرف اشارہ کریں گے جو انبیاء اور حق کے داعیوں کے کلام کی خصوصیات میں سے ہیں، اور جن کو ان کے کلام کی تاثیر میں، ان کی اعلیٰ سیرت اور پاکیزہ تعلیم کے سوا، ہر چیز سے زیادہ دخل ہے اور جن سے کوئی داعیِ حق بھی کسی زمانہ میں مستغنی نہیں ہو سکتا۔

پہلی خصوصیّت: سب سے پہلی چیز جو ہمیشہ انبیاء اور حق کے داعیوں کی خصوصیات میں سے رہی ہے، یہ ہے کہ انھوں نے جس قوم کو دعوت دی ہے، اسی کی زبان

میں دعوت دی ہے، تاکہ قوم کے ہر گروہ اور ہر طبقہ پر اللہ کی حجت پوری ہو سکے۔ (وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ) (اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس کی قوم کی زبان کے ساتھ، تاکہ وہ ان پر اچھی طرح حق کو واضح کر سکے)۔

جس طرح یہ بات بالکل فطری اور معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر داعیٔ حق کی دعوت کا اصل میدان اس کی اپنی قوم کے اندر ہونا چاہئے اور قوم کو گمراہی میں چھوڑ کر اس کے لیے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو کلمۂ نصیحت سنانے کے لیے خشکی و تری کا سفر کرے، اسی طرح یہ بات بھی بالکل فطری اور معقول معلوم ہوتی ہے کہ ہر داعیٔ حق کو اپنی قوم ہی کی زبان کو اس کے اندر دعوت کا ذریعہ بنانا چاہئے۔

جو لوگ ان باتوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ اصلی حق داروں کی بھی حق تلفی کرتے ہیں اور اپنی صلاحیتِ کار کو بھی برباد کرتے ہیں، اور ان دونوں باتوں کے لیے وہ عند اللہ جواب دہ ہوں گے۔ ہر آدمی جس قوم کے اندر پیدا ہوتا ہے اس قوم کے اندر جس خوبی کے ساتھ وہ کام کر سکتا ہے کسی دوسری قوم کے اندر اس خوبی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ اور اپنی قوم کی زبان میں اس کی دعوت جتنی مؤثر ہو سکتی ہے کسی اور زبان میں نہیں ہو سکتی۔ اس وجہ سے ہر داعیٔ حق کے لیے صحیح طریقِ کار یہی ہے کہ وہ اپنی قوم ہی کی زبان کو اپنی دعوت و تبلیغ کا ذریعہ بنائے، اور اس بات کی ہر گز پروا نہ کرے کہ کوئی دوسری زبان اس کی اپنی زبان سے زیادہ ترقی یافتہ اور وسیع ہے، اور اس میں تقریر کرنا یا مضمون لکھنا زیادہ وسیع حلقہ تک اپنے خیالات کو پہنچانے اور زیادہ عزت و شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ایک داعیٔ حق کے پیشِ نظر اوّلین شے یہ نہیں ہونی چاہئے کہ جو دعوت وہ لے کر اٹھا ہے اس کے زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ جانے کا ذریعہ کیا ہو سکتا ہے، بلکہ اسے سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ جن لوگوں کی ہدایت و خدمت پر وہ خدا اور فطرت کی طرف سے مامور ہے ان کے دلوں میں گھسنے کا سب سے زیادہ مؤثر اور قریبی ذریعہ کیا ہے۔ اگر وہ ذریعہ تنگ اور محدود ہو اور

اس کے اختیار کرنے سے اس کی شہرت اور شخصیت کو نقصان پہونچ رہا ہو تو بھی اُس کو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے، بلکہ اسی کو اختیار کرنا چاہیے۔ کیونکہ جو مقصد اس کے پیش نظر ہے اس کے حاصل ہونے کا ذریعہ وہی ہے۔ جس دہقان کی جھولی میں صرف چند بیج ہیں، اور ان کو بہر حال وہ اپنے چھوٹے سے کھیت ہی میں بونا چاہتا ہے اُسے ان لوگوں پر رشک نہیں کرنا چاہیئے جو نہایت وسیع رقبوں میں تخم ریزی کر رہے ہیں، بلکہ جو رقبہ اس کے حصّہ میں آیا ہے اپنی ساری توجّہ اسی پر مرکوز کرنی چاہیئے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ "میرے پاس جو روٹی ہے وہ بچّوں ہی کے لیے کافی ہے، میں اس کو کتّوں کے آگے ڈال کر بچّوں کو بھوکا نہیں رکھ سکتا۔"

حضرت مسیحؑ کے اس قول پر بعضوں نے نافہمی سے اعتراضات کیئے ہیں۔ اور ان پر العیاذ باللہ تنگ نظری کا الزام لگایا ہے۔ حالانکہ انھوں نے جو بات فرمائی ہے بالکل حقیقت ہے۔ ہر آدمی کے کام کرنے کا ایک فطری دائرہ ہے، اور وہ صحیح اور نتیجہ بخش کام اسی وقت تک کر سکتا ہے جب تک اپنی جد وجہد کو اس دائرے کے اندر محدود رکھے۔ اگر وہ اس سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرتا ہے تو گو وہ اس مغالطہ میں مبتلا ہوتا ہے کہ اب اس کی جد وجہد کا میدان پہلے کی نسبت زیادہ وسیع ہو گیا ہے لیکن حقیقت میں وہ اپنی قوت کو ضائع کر رہا ہوتا ہے۔

دوسری خصوصیّت: انبیاء اور داعیوں کے کلام کی دوسری خصوصیّت یہ ہے کہ ان کا کلام، کلامِ مبین ہوتا ہے۔ کلامِ مبین سے مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کی اس بولی میں گفتگو کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ خوبی اور صفائی کے ساتھ حرفِ مدّعا کو قوم کے ہر حلقہ تک پہنچا سکے۔ اس میں نہ اجمال وابہام ہوتا ہے، نہ غیر ضروری طوالت نہ استعارات وتشبیہات کی کثرت ہوتی ہے نہ عقل آزما تلمیحات کی زیادتی، نہ ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار ہوتی ہے نہ رکاکت اور ابتذال کا کوئی شائبہ، دُھلی ہوئی زبان

بے تکلف، استعارے حقیقت کو مجاز کے بھیس میں دکھا دینے والی تشبیہیں اور تمثیلیں۔ علاوہ ازیں غصّہ کے بجائے دل سوزی، سختی کے بجائے نرمی اور آرائش بیان کے بجائے سادگی اور صفائی، وہ اپنے وقت کی مختلف طرزوں (اسٹائل) میں سے اس طرز کو اختیار کرتے ہیں جو وقار، اثر انگیزی اور وضاحتِ مقصد کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور اعلیٰ ہوتی ہے پھر اپنے نفس کی بلندی، اپنے ولولۂ دعوت کی گرمی و دل سوزی اور اپنے علم کی یقین آفرینی، اور ایمان بخشی اور سب سے زیادہ اپنے مدّعا کو سمجھانے کی گہری خواہش سے اس کو اس قدر ترقی دے دیتے ہیں کہ ان کا اپنا ایک نیا اسٹائل پیدا ہو جاتا ہے، جو خود نمونہ اور مثال کا کام دینے لگتا ہے۔ اس اسٹائل کی اصلی خصوصیت اس کی دل نشینی اور افہام کی صلاحیت ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کی روانی اور سادگی کی وجہ سے اس میں ایسی ادبی خوبی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے آگے بڑے بڑے ادیبوں کے کلام بالکل بے جان معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کے لفظ لفظ سے رس ٹپکتا ہے، اور فقرہ فقرہ سے رُوح کو غذا ملتی ہے۔ اس کی تاثیر سے نہ صرف افراد کی بلکہ قوموں کی زندگیاں بدل جایا کرتی ہیں۔ اور ایک داعیٔ حق کے ہاتھ میں یہ وہ طاقت ہے جس کا مسلح فوجوں سے بھی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء نے جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، اس کے لیے دعائیں کی ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں دعوتِ دین کی اس مظلومیت پر ترس آتا ہے کہ یہاں جو حضرات اس فرض کو انجام دے سکتے تھے، یعنی علمائے دین، وہ ہمیشہ اپنی کج مج بیانی کے لیے بدنام رہے ہیں۔

اوّلاً تو یہ حضرات اس زبان میں لکھنے اور بولنے ہی کو کسرِ شان سمجھتے رہے ہیں جس زبان کو یہاں "لسانِ قوم" کی حیثیت حاصل تھی۔

ثانیاً اگر اس میں انھوں نے لکھنا اور بولنا شروع بھی کیا تو ان کی ایک خاص زبان بن گئی جو اپنی ثقالت، اپنی خشکی اور اپنی غیر ضروری طوالت یا اپنے مانع فہم اختصار

کے لیے مشہور رہے۔ یہاں تک کہ کسی کتاب سے لوگوں کو بدگمان کر دینے کے لیے یہ فقرہ بالکل کافی ہوتا ہے کہ اس کا طرزِ تحریر بالکل "مولویانہ" ہے۔ یہ صورتِ حال بجائے خود نہایت رنجدہ تھی۔ لیکن مزید ستم یہ ہوا کہ یہ حضرات تو اپنی "ثقلِ زبانی" کے لیے بدنام رہے اور جو گروہ مذہب سے بے تعلق یا اس کا مخالف تھا۔ اس نے قوم کی زبان پر قبضہ کر لیا، اور اب تک بظاہر اسی کا قبضہ چلا آ رہا ہے۔

تیسری خصوصیّت: انبیاء اور حق کے داعیوں کے کلام کی تیسری خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے ایک مقصد کی طرف ہزار راہوں سے آتے ہیں۔ قرآن مجید کی اصطلاح میں اس چیز کو تصریفِ آیات سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ایک مدّعا کو مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے سمجھانے کی کوشش کرنا۔ میر انیس مرحوم کے الفاظ میں ع

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

داعی کے کلام میں یہ گونا گونی اس کے اصل مقصد یعنی افہام اور اتمامِ حجت کے لحاظ سے ضروری ہے۔ جو بات ایک پہلو سے نہیں سمجھ میں آتی وہی بات جب دوسرے پہلو سے سامنے آتی ہے تو اس طرح دل میں اُتر جاتی ہے گویا ہمارے ہی دل کی بات تھی۔ آدمیوں کے مذاق اور رجحانِ طبیعت کی طرح ان کے دماغ کے کینڈے بھی مختلف ہوا کرتے ہیں۔ اور حالات کے اختلاف سے اُن کے رُخ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جو شخص ان کے دل میں کوئی بات مسلکِ زندگی کی حیثیت سے اتارنے کا درد رکھتا ہو وہ ان کے کینڈے کے اختلاف اور رُخ کی تبدیلی کے لحاظ سے مختلف سمتوں سے ان کے پاس آئے۔ اگر ایک ہی راہ سے اور ایک ہی رنگ میں آئے گا تو ایک داعی کی حیثیت سے وہ اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے گا۔ کیونکہ اس کی یہ یک رنگی اس فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ جو اپنے ہر گوشہ میں تنوع پسند اور رنگا رنگ واقع ہوئی ہے جو لوگ داعی کے فرض کی نوعیّت اور انسانی فطرت کے ان احوال سے واقف

نہیں ہیں ان کے سامنے جب داعیانہ کلام آتا ہے تو وہ اس پرناک بھوں چڑھاتے ہیں، کہ اس میں غیر ضروری طوالت ہے، اس میں ایک ہی بات کی تکرار ہے، یہ تھکا دینے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔ وہ اس بات پر نہیں غور کرتے کہ ایک داعی کا کام ایک اکیڈمک طرز کے مضمون نگار سے بالکل مختلف ہوا کرتا ہے۔ اس کے پیشِ نظر صرف چند یک رنگ آدمیوں کے سامنے ہی اپنے خیال کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، اور اس بے چارے کو مختلف المزاج ــــ مختلف الفطرت اور مختلف الاستعداد دلوں کے اندر اپنی بات اُتارنے کے لیے جتن کرنا پڑتا ہے۔ اس کی کامیابی کے لیے یہ بس ہے کہ اس نے اپنا مافی الضمیر ایک خوبصورت اسلوب سے ادا کر دیا۔ اور اس کی کامیابی کے لیے یہ شرط ہے کہ دوست دشمن سب پکار اُٹھیں کہ تو نے پہنچانے کا حق ادا کر دیا وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (اسی طرح ہم ...... اپنے دلائل مختلف ڈھنگ سے بیان کرتے ہیں، تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائیں اور پکار اٹھیں کہ تم نے سُنانے کا حق ادا کر دیا اور تاکہ اُن لوگوں کے لیے، جو علم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ہم پوری طرح اس کو واضح کر دیں)۔

چوتھی خصوصیّت: داعیانِ حق کے کلام کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ جس طرح وہ حجّت واستدلال سے مملو ہوتا ہے، اسی طرح جوش اور جذبہ سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ وہ خشک فلسفیوں کی طرح صرف عقل ہی کو خطاب نہیں کرتے، بلکہ انسان کے اعلیٰ جذبات سے بھی اپیل کرتے ہیں۔ جذبات سے اپیل کرنا کوئی بُرائی نہیں ہے، بُرائی اگر ہے تو انسان کے حیوانی جذبات سے اپیل کرنا ہے، جس سے اہل حق ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں۔ انسان کے اندر اصلی محرّک طاقت عقل نہیں ہے، بلکہ جذبات ہیں، اس وجہ سے کوئی داعی، جو زندگی کے نظام میں کسی تبدیلی کی دعوت لے کر اُٹھا ہو یا پورے نظام زندگی کو ڈھا کر اس کو از سرِ نو نئی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہو، بغیر جذبات کو اُبھارے اپنے مقصد کی راہ میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جو حضرات اپنی علمی تحقیقات

کے نوادر و لطائف بیان کر کے دوسروں کو محظوظ کر دینے اور اپنا جی خوش کر لینے کو مقصودِ زندگی بنائے ہوئے ہوں، وہ اس داعیانہ رنگ کو " مدعیانہ رنگ " خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ ایک داعی کے کلام میں جو جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہ ادّعاء کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ یا تو یہ اس کے اس اعتقادِ راسخ CONVICTION کا نتیجہ ہوتا ہے جو اس کے دل کے اندر جوش مار رہا ہوتا ہے یا اس ہمدردی اور دلسوزی کا اثر ہوتا ہے جس کی آگ اس کے سینہ کے اندر بھڑک رہی ہوتی ہے جو لوگ ایک داعی کی اس خاص حالت سے واقف نہیں ہوتے اور محض قرطاس و قلم کے مشغلہ کے اشتراک کی وجہ سے اسے بھی اپنا ایک ہم پیشہ سمجھے بیٹھے ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ اس کا کلام ان کے کلام کی طرح مُردہ اور بے روح نہیں ہے، بلکہ زندہ اور زندگی بخشنے والا ہے تو اس کے جوش کو غرور اور ادّعاء پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ شکل و صورت کے اتحاد کے باوجود سیرتیں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ کچھ ضرور نہیں کہ ہر سفید چیز چربی ہی ہو۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ یار   فکرِ ہر کس بقدرِ ہمّت اوست

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا خطب احمرت عیناہ وعلا صوتہ واشتد غضبہ حتّٰی کانہ منذر جیش یقول صبّحکم ومسّاکم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ دیتے آنکھیں سرخ ہو جاتیں آواز بھاری ہو جاتی، جوش تیز ہو جاتا، یہاں تک کہ معلوم ہوتا کہ آپؐ کسی دشمن فوج کے آپڑنے کے خطرہ سے آگاہ کر رہے ہیں، فرماتے وہ تم پر صبح کو آپڑے یا شام کو)۔

ظاہر ہے کہ آپؐ کے کلام میں یہ گرمی آپؐ کے یقین اور قوم کے ساتھ ہمدردی کے جذبہ سے پیدا ہوتی تھی، اور ہر سچّے داعی پر اس طرح کی حالت طاری ہو سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض لوگ بالکل نمائشی طور پر بھی جوش و جذبہ کا اظہار کیا کرتے ہیں، بلکہ بسا اوقات دعاوی

اور شطحات پر بھی اُتر آتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہر شخص ایسا ہی ہو۔ جو لوگ جھوٹے ہوتے ہیں وہ زیادہ دنوں تک اپنے جھوٹ کو چھپا نہیں سکتے۔ زمانہ کھرے کھوٹے میں امتیاز کر ہی لیتا ہے۔ کوّا نمائشی پر لگا کر کب تک طاؤس بنا پھرے گا۔

پانچویں خصوصیّت : پانچویں خصوصیّت ان کے کلام کی یکرنگی اور وحدت مقصد ہے۔ وہ اپنے ترکش کا ہر تیر ایک ہی نشانہ پر مارتے ہیں۔ پیشہ ور مضمون نگاروں اور مقرروں کی طرح ان کا طریقہ یہ نہیں ہوتا کہ آپ ان سے جس پلیٹ فارم پر چاہیں تقریریں کرائیں جس عنوان پر چاہیں مضمون لکھالیں، اور جس جلسہ کی چاہیں صدارت کرالیں وہ اپنے لفظ لفظ اور فقرے فقرے کو اللہ کی دی ہوئی امانت سمجھتے ہیں اور اس کے خاص مصرف کے سوا کہیں اور اس کو ضائع نہیں کرتے۔ آپ ان کی ہر تحریر و تقریر میں ایک ہی صدا پائیں گے، دوسرے موضوع کتنے ہی دلفریب کیوں نہ ہوں، ان پر تقریر و تحریر سے کتنی ہی بڑی عزت و شہرت کیوں نہ حاصل ہو رہی ہو، بظاہر ان میں دینی و ملّی فوائد کا کوئی پہلو بھی کیوں نہ نظر آرہا ہو، لیکن وہ کسی غیر متعلق یا ضمنی چیز پر اپنی زبان اور اپنے قلم کی قوّت صرف نہیں کرتے۔

اس چیز کو قرآن نے فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ "ہر وادی میں بھٹکنے" سے تعبیر کیا ہے اور انبیاء اور صلحاء کو اس سے بری قرار دیا ہے۔ اس دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ اس دنیا میں بُرا یا بھلا کوئی انقلاب اگر پیدا ہوا ہے تو اُن ہی لوگوں کے زبان و قلم سے ہوا ہے، جنہوں نے اپنی ساری قوت کسی متعین ہدف پر صرف کی ہے یوں ہی ہوا میں چوپائی تیر نہیں پھینکتے رہے ہیں۔

چھٹی خصوصیّت : چھٹی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام کو ہر اس چیز سے پاک رکھتے ہیں جو مخاطب کے اندر ضد اور مخالفت کا جذبہ پیدا کرے، کیونکہ یہ چیز اُن کے مقصد کے بالکل خلاف ہے، مثلاً مخاطب سے گفتگو کے وقت نہ تو اپنی برتری کا اظہار

کریں گے، نہ اس کی غلط زندگی پر بانداز استخفاف تنقید کریں گے بلکہ جو کچھ کہیں گے نرمی اور ہمدردی کے ساتھ کہیں گے:

اِذْهَبَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی ٥

فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہوگیا ہے اور اسے نرمی سے سمجھاؤ، تاکہ وہ یاددہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

اسی طرح وہ اپنی زبان سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتے جس سے مخاطب کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔ دلائل سے اس کے غلط مزعومات کی پُرزور تردید تو کرتے ہیں لیکن خواہ مخواہ تحیف الفاظ استعمال کر کے اپنے مقصد کو اپنے ہی ہاتھوں نقصان نہیں پہنچاتے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَیَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ۔

اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں ان کو گالی نہ دو کہ وہ تجاوز کر کے بے جانے بوجھے اللہ کو گالی دے بیٹھیں۔

مخاطب کی ترش کلامی اور بدسلوکی کا جواب بھی شیریں کلامی سے دیتے ہیں، کیونکہ ایک داعیٔ حق کے لیے دلوں کے اندر راہ پانے کا طریقہ یہی ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّیِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ٥ وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَمَا یُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ۔

بُرائی اور بھلائی دونوں یکساں نہیں ہوسکتیں بُرائی کو بھلائی سے دفع کرو تو تم دیکھو گے کہ جو تمہارا دشمن تھا اب وہ گویا تمہارا دلی دوست بن گیا ہے اور یہ حکمت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو صبر کرنے والے ہوتے ہیں اور ان کو ملتی ہے جو بڑے نصیبہ ور ہوتے ہیں، اگر تمہارے دل میں شیطان کی طرف سے کوئی دغدغہ پیدا ہی ہوجائے تو اللہ کی

پناہ ڈھونڈو، وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

مناظرانہ اندازِ کلام سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر مخاطب کے متعلق اندازہ ہو جائے کہ وہ مناظرہ پر اُتر آیا ہے تو داعیٔ حق سلام کرکے وہاں سے چل دیتا ہے، کیونکہ مناظرہ بازی اور دعوتِ حق میں تضاد ہے:

فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ وَإِن جَادَلُوكَ فَقُلِ اللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ اللَّهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كُنتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ ۝

پس وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑنے کی کوئی راہ نہ پائیں اور تم اپنے رب کی طرف دعوت دو، تم ایک سیدھی راہ پر ہو اگر وہ تم سے مناظرہ کرنا چاہیں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ تمہارے درمیان قیامت کے روز فیصلہ کرے گا ان چیزوں کے بارے میں جن میں تم اختلاف کر رہے ہو۔

مناظرہ اگر کرتے بھی ہیں تو نہایت بہتر طریق پر، یعنی اپنے اور مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کرکے اس کے لوازم و نتائج کی دعوت دیتے ہیں:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۝ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلَٰهُنَا وَإِلَٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝
(۴۶ عنکبوت)

اور اہلِ کتاب سے مناظرہ نہ کرو مگر اس طریق پر جو بہتر ہے سوا ان کے جنہوں نے ظلم کیا ان میں سے اور کہو ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہم پر اُتاری گئی اور اس چیز پر جو تمہاری طرف اتاری گئی اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

ساتویں خصوصیت : داعیِ حق کے کلام کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ وہ لفظ اور معنی، طول اور اختصار، انداز بیان اور لب و لہجہ میں سننے والے کی نفسیات کا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ مثلاً حضورؐ نے فرمایا "خوشخبری دو، لوگوں میں نفرت نہ پیدا کرو"۔
اسی طرح آپؐ نے تاکید فرمائی کہ جب نصیحت کرو تو مختصر کرو۔
خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانشمندی کی علامت قرار دیا :

یقول ان طول صلوٰۃ الرجل	فرماتے تھے آدمی کی نماز کا طویل ہونا
وقصر خطبتہ مئنۃ من فقھہ	اور خطبہ کا مختصر ہونا اس کی سوجھ بوجھ کی
فاطیلوا الصّلوٰۃ واقصروا الخطبۃ	علامت ہے، تو نماز لمبی کرو اور خطبہ مختصر کرو،
وان من البیان لسحرا۔	اور بعض بیان جادو ہوتے ہیں۔

اگر مخاطب کم فہم ہو یا بات باریک ہو تو بات کو دہرا دینا چاہیئے تاکہ سننے والا اچھی طرح سُن سکے اور اس کو سمجھ سکے۔

کان النّبی صلی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات فرماتے
اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثًا	تھے تو اسے تین بار دہراتے تھے، تاکہ
حتی تفھم عنہ۔	خوب سمجھ میں آجائے۔

انبیائے کرامؑ کا طرزِ استدلال

حضرات انبیائے کرامؑ اور داعیانِ حق جس مقصد کو لے کر اُٹھتے ہیں وہ ایمان کی دعوت ہے۔ ایمان کوئی منفی چیز نہیں ہے بلکہ ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کا اصلی فائدہ صرف اس صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب یہ پوری طرح دل میں راسخ ہو۔ یہ استحکام و درسوخ پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی بنیاد نہایت پائے دار اور محکم استدلال پر ہو۔ اس کے بغیر نہ تو یہ ایمان، زندگی کے لیے ایک محرک کا کام دے سکتا۔ نہ اس سے دین کی تمام اعتقادی و عملی جزئیات وجود میں آسکتیں، اور نہ یہ زندگی کے وسیع الاطراف گوشوں میں انسان کی نگرانی کر سکتا۔ اس وجہ سے داعیانِ حق کا کام نہ مجرد تحکم سے چل سکتا۔ نہ مغالطہ دے کر وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے نہ الزامی قسم کے دلائل ان کے کام آسکتے، نہ محض شاعرانہ اور خطیبانہ قسم کا استدلال، جو فطرت اور عقل کے اندر اپنی کوئی اساس نہ رکھتا ہو، ان کے مقصد کو پورا کر سکتا۔ اس طرح کے مجادلانہ اور الزامی و خطابی طرزِ استدلال سے وہ لوگ تو بے شک اپنا کام چلا لے جاتے ہیں جن کے پیشِ نظر صرف مخاطب کو ساکت کر دینا یا اس کو مغالطہ میں ڈال کر اپنا کوئی مقصد حاصل کر لینا ہو، لیکن جن کے سامنے مخاطب کو چُپ کرانا نہیں، بلکہ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو صحیح راہ پر چلنے کے لیے بیدار کرنا ہو، اور جن کا مقصد لوگوں کو مسحور یا مرعوب کر کے کسی راہ پر ہانک دینا نہیں

بلکہ ان کی فطرت اور عقل کو اس طرح جگا دینا ہو کہ مشکل سے مشکل راہوں میں ہر شخص خود اپنی رہنمائی کر سکے وہ اولاً تو استدلال کی ان قسموں کو سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگاتے اور اگر لگاتے بھی ہیں تو اس امر کو پوری طرح نگاہ میں رکھتے ہیں کہ ایک پاک اور اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ اس کے وسائل و ذرائع بھی نہایت پاک اور اعلیٰ ہوں، اس چیز نے انبیائے کرامؑ اور داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کو دوسروں کے طرزِ استدلال سے بالکل ممیز کر دیا ہے، جس کی بعض نمایاں خصوصیات کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

استدلال کی عمومیّت

استدلال ہوا اور پانی کی طرح ایک عام ضرورت کی چیز ہے ہر انسان زندگی کو صحیح طور پر بسر کرنے کے لیے ایمان کا محتاج ہے، اور محکم ایمان بغیر محکم استدلال کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے استدلال کے لیے دو باتیں ضروری ہوئیں۔

پہلی یہ کہ استدلال کا طریقہ اتنا فطری اور سادہ ہو کہ ہر شخص جس طرح اپنی ضرورت کے مطابق زمین اور فضا کے ذخیرۂ آب و ہوا سے ہوا اور پانی حاصل کر لیتا ہے اور اس میں اس کو کوئی خاص دقّت نہیں پیش آتی۔ اسی طرح ہر شخص زمین و آسمان کے آثار و آیات سے اپنے اطمینانِ قلب کے لیے جس قدر چاہے دلیلیں پیدا کر لے اور اس میں اس کو تفکّر و تذکّر کے سوا کسی اور چیز کا اہتمام نہ کرنا پڑے۔

دوسری یہ کہ جس طرح انسان کی جسمانی صحت کے لیے ضروری ہے کہ جس پانی کو وہ پی رہا ہے وہ صاف ہو اور جس ہوا میں سانس لے رہا ہے وہ تازہ ہو، اسی طرح اس کی عقلی صحت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس استدلال سے اصولِ زندگی حاصل کر رہا ہے وہ بالکل بے آمیز، بالکل خالص اور بالکل پاک ہو۔ ان دونوں باتوں کو حاصل کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرامؑ اور داعیانِ حق کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ انھوں نے ایک طرف تو استدلال و حجّت کے ان مصنوعی طریقوں سے ہٹ کر اپنی راہ

نکالی ہے جو کسی قوم میں علمی و فنّی ترقیوں سے پیدا ہو جایا کرتے ہیں اور خاص پیشہ ور گروہ کے سوا دوسرے اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ دوسری طرف اس تمام مواد کا انھوں نے جائزہ لیا ہے جو استدلال و حجّت کے لیے کام میں لایا جاتا رہا ہے، اور اس میں سے چھانٹ کر صرف اس چیز کو وہ اپنے استدلال و حجّت کے لیے کام میں لائے ہیں، جو ہر قسم کی غیر فطری ملاوٹ سے پاک ثابت ہوا ہے۔

اس طرزِ استدلال کا پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کا ایک انبوہِ عظیم، جو اس سے پہلے بالکل اندھا بہرا بنا ہوا گنتی کے چند انسانوں کے پیچھے پیچھے چل رہا ہوتا ہے۔ دفعتہً خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے اور اپنے کانوں سے سننے لگتا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک سڑے گلے موادِ استدلال کے نگلتے رہنے کی وجہ سے دلوں اور روحوں پر جو مردنی طاری تھی اس صالح موادِ استدلال کے چند لقمے حلق سے اُتارتے ہی دفعتہً دور ہو جاتی ہے، اور کھانے والا اپنے آپ کو بالکل تازہ دَم اور چاق چوبند محسوس کرنے لگتا ہے۔

داعیانِ حق اور انبیائے کرامؑ کے طرزِ استدلال کی یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے عقلِ انسانی ان کے زمانے میں کروٹ لیتی ہے اور ایک عام ذہنی بیداری ہر گوشہ میں نمودار ہو جاتی ہے، یہاں تک کہ ان گوشوں میں بھی ایک حرکت پیدا ہو جایا کرتی ہے جہاں سے کسی اچھی خبر کی کسی کو بھی امید نہیں ہوتی۔ ہر طرف تنقید کی نگاہیں کھل جاتی ہیں، ہر آنکھ دیکھنے اور ہر زبان بولنے لگتی ہے۔ فکر و استدلال کے پُرانے طریقے جو اب تک نہایت محبوب چلے آ رہے تھے، فرسودہ اور دقیانوسی معلوم ہونے لگتے ہیں، بہت سے نظریات، جنھوں نے وحی و الہام کا درجہ حاصل کر رکھا تھا، بالکل بے مصرف اور بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ یہ ذہنی انقلاب ان لوگوں پر بہت گراں گزرا کرتا ہے، جو اپنی قدیم محبوبات و مالوفات کو حق سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس

میں مزاحمت پیدا کریں۔ لیکن نہ تو اس چیز کو روکا جا سکتا نہ اس کو روکنا صحیح ہے البتہ جس چیز کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ یہ چیز ہے کہ جو ذہنی آزادی پیدا ہو رہی ہے اس کا بہاؤ صحیح رُخ پر ہو، اس میں بے اعتدالی اور مطلق العنانی نہ پیدا ہونے پائے۔ چنانچہ اس فرض سے داعیانِ حق خود اچھی طرح آگاہ ہوتے ہیں۔ اور وہ اس بات کی پوری نگرانی کرتے ہیں کہ جو فکری آزادی وہ لوگوں کو دے رہے ہیں وہ ان کے لیے نجات کا ذریعہ ہو، ہلاکت کا سبب نہ بنے۔

مخاطب کے اندر فکرِ صالح کی تخم ریزی

انبیاء اور اہل حق کے طرزِ استدلال کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف دلیل نہیں دیتے بلکہ مخاطب میں استدلال کرنے کی قابلیت بھی پیدا کرتے ہیں۔ وہ انفرادی و اجتماعی زندگی میں جس ہمہ گیر انقلاب کی دعوت لے کر آتے ہیں۔ وہ انقلاب اس وقت تک پائدار بنیادوں پر قائم نہیں ہو سکتا، جب تک وہ انسان کی فکری و نظری صلاحیتوں کو پوری طرح جگا نہ دیں۔

زندگی کوئی مفرد اور بسیط چیز نہیں ہے کہ اس کو صحیح طور پر گزار دینے کے لیے چند گنے چنے اصولوں کی رہنمائی کافی ہو سکے۔ یہ گوناگوں ظاہری و باطنی مطالبات و مقتضیات کا مجموعہ، بے شمار انفرادی و اجتماعی روابط و علائق کا شیرازہ، ان گنت شخصی عائلی اور نوعی حقوق و فرائض کا ایک گنجینہ ہے۔ پھر وہ پوری کی پوری ہماری نظروں کے سامنے موجود بھی نہیں ہے کہ ہر شخص کی گرفت میں آسکے، اور تجربہ و مشاہدہ کی روشنی میں اس کی ہر حالت کے لیے پہلے سے ایک حکم معین ہو سکے۔ بلکہ اس کا ماضی اور مستقبل دونوں غیب کے پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ صرف تھوڑا سا حاضر ہے جس کے اشارات کی روشنی میں اس کے ماضی کو بھی سمجھنا پڑتا ہے اور اسی کی رہنمائی سے اس کے مستقبل کو بھی معین کرنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں زندگی کے لیے قانون و آئین کے صرف

متعین و محدود ضابطے کافی نہیں ہو سکتے، بلکہ ضروری ہے کہ اس ضابطے کے ساتھ انسان کے اندر فکرِ صالح کی ایک ایسی کبھی نہ بجھنے والی روشنی بھی ہو جو زندگی کے ان مخفی گوشوں میں بھی اس کی رہنمائی کر سکے جن میں رہنمائی کے لیے اس کے پاس کوئی ضابطہ نہ ہو، یہ فکرِ صالح انبیاء اور اہلِ حق کے طرزِ استدلال سے خود بخود مخاطب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ انبیاء جب اپنی اصولی تعلیمات کا آغاز کرتے ہیں تو اس کی طرح ہی اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس فکرِ صالح کی تخم ریزی کے لیے خود بخود دلوں اور روحوں کے اندر زمین بھی ہموار ہو جاتی ہے اور اس کے بیج بھی پڑ جایا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک طرف شریعت کا ایک شاداب باغ تیار موجود ہوتا ہے جو ہر شخص کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے اور دوسری طرف حکمت کا ایک لہلہاتا ہوا چمن بھی وہ ہر قلبِ صالح کے اندر اگا دیتے ہیں، جو اگرچہ نگاہوں کے سامنے نہیں ہوتا لیکن اس کی بہار ہمیشہ قائم، اس کی شاخیں ہر موسم میں ثمر بار رہتی ہیں۔ بظاہر تو اس کی حیثیت انبیاءؑ کی اصل تعلیم کے مقابل میں ایک ضمنی کاشت اور ضمنی پیداوار کی ہے۔ لیکن اپنی قدر و قیمت اور اپنے بیش بہا فوائد کے اعتبار سے یہ اصل کے برابر جگہ پاتی ہے۔ یہی یہ چیز ہے جس کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا ہے کہ:

"مجھے قرآن دیا گیا اور اسی کے مثل اس کے ساتھ ایک اور چیز" اسی شجرِ مبارک کے پھل پھول ہیں جو ہمیں احادیث کی صورت میں ملے ہیں۔ یہی چیز ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "جس کو یہ چیز ملی اس کو خیرِ کثیر کا خزانہ ملا"۔

اسی کی نسبت قرآن میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "صرف نصیبہ ور لوگ ہی ہیں جن کو یہ چیز ملتی ہے"۔ اور اسی کو بعض احادیث میں ایسے خزانہ سے تشبیہہ دی گئی ہے جو کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔

منطقی طرزِ استدلال یہ تخلیقی صفت صرف اہلِ حق اور حضرات انبیائے کرامؑ کے طرزِ استدلال کے ساتھ مخصوص ہے کہ کسی مناظر و متکلم کے استدلال میں یہ چیز آپ کو نہیں مل سکتی۔ ہمارے علماء منطقی طرزِ استدلال کو بڑی اہمیت دیتے رہے ہیں۔ لیکن منطقی طرزِ استدلال اس پہلو سے سب سے زیادہ ناقص ہے۔ منطق کو زیادہ سے زیادہ جو عزت دی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک استدلال کو اپنی کسوٹی پر جانچ کر وہ بتا سکتی ہے کہ یہ استدلال صحیح ہے یا نہیں۔

استدلال کی قابلیت پیدا کرنا اس کے بس سے باہر ہے اور یہ کام بھی منطق سے صرف ایک خاص حد ہی تک لیا جا سکتا ہے۔ قرآن میں اور انبیاء کے کلام میں ہم کو استدلال کی ایسی نازک قسمیں بھی ملتی ہیں جن کو منطق کی ترازو پر سرے سے تولا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن ہمارے متکلمین نے جنھوں نے منطق کو اس کی حیثیت سے زیادہ درجہ دیا، کوئلہ تولنے کی اسی ترازو سے قرآن کی ان اشرفیوں کو بھی تولنا چاہا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اشرفیوں کو کوئلوں سے کم تر قرار دے بیٹھے۔

باقی رہے اہلِ فلسفہ، تو اس میں شبہ نہیں کہ وہ فکرِ انسانی کو اس بات کی تربیت ضرور دیتے ہیں کہ وہ استدلال و استنباط کے مختلف میدانوں میں جولانی کر سکے، لیکن انھوں نے اپنے موادِ استدلال، اپنے طرزِ استدلال اور اپنے ذرائع استدلال، تینوں کو رطب و یابس کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے طریقے پر سوچنے والا انسان حیرانی، سرگشتگی کے سوا کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کی رہنمائی میں اگر انسان چند قدم صحیح راہ میں اُٹھاتا ہے تو ساتھ ہی مجبور ہوتا ہے قدم غلط سمت میں بھی اُٹھائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی ساری زندگی مختلف وادیوں کی آوارہ گردی اور اٹکل کے تیر تکّے چلانے میں گزر جاتی ہے۔ اور چند متناقص و متضاد اُلجھے ہوئے افکار کے سوا اس کے پلّے کچھ نہیں پڑتا۔ اس معاملہ میں فلسفہ قدیم ہو یا فلسفہ جدید سب کا حال

یکساں ہے۔ سب کے اصولِ فکر میں الجھاؤ اور ہر ایک کے نتائج فکر میں پریشانی ہے اور اب تو جب کہ سائنس کی ترقیوں نے سارا مدار تجربہ و مشاہدہ پر قائم کر دیا ہے اور انسان اس خبط میں مبتلا ہو گیا ہے کہ وہ کوئی چیز بھی بغیر سر کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے نہیں مانے گا۔ سرے سے توقع ہی اس بات کی نہیں رہ گئی ہے کہ اس کا ایک قدم بھی جادۂ مستقیم پر پڑے گا۔ اب تک فلسفہ کی بنیاد جن اصولوں پر تھی ان میں سے اگر بعض غلط تھے تو بعض صحیح بھی تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے خواب ہائے پریشاں میں سے بعض خواب سچے بھی نکل آتے تھے اور آدمی کے لیے صرف سچے اور جھوٹے میں امتیاز کی مشکل تھی لیکن اب تو سارا تکیہ حس و مشاہدہ پر رہ گیا ہے اور حس و مشاہدہ کی جہانگیری معلوم ہے کہ وہ کہاں تک ہے۔ اس مادی فلسفہ کے علاوہ آج اگر کوئی چیز فلسفہ کے نام سے موجود ہے تو وہ اہلِ تشکیک کا فلسفہ ہے، جس کی ساری بنیاد حواس و عقل کی بے اعتباری پر قائم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی فلسفہ نہیں بلکہ تمام علم و فلسفہ کی کلی نفی ہے اور دنیا کو حیرانی کے سوا اس سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرات انبیائے کرامؑ کا طریقۂ استدلال نہ اہلِ منطق کے طریقہ کی طرح بانجھ ہے اور نہ اہلِ فلسفہ کے طریقہ کی طرح پریشان کن۔ بلکہ وہ فکرِ انسانی کی اس طرح تربیت کرتے ہیں کہ وہ خود بخود صحیح راہ پر چلنے لگے، اور منزلِ مقصود کا سراغ، اس کے اندر یہ یقین پیدا کر دے کہ اس نے جو راہ اختیار کی ہے وہ صحیح ہے۔ وہ پہلے تو ماخذ استدلال کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ یعنی آفاق و انفس کی طرف۔ آفاق سے مراد نظامِ کائنات کے وہ آثار و آیات اور قوانین و ضوابط ہیں جو اس دنیا میں ہر شخص کو بادنیٰ توجہ نظر آتے ہیں۔ انفس سے مراد وہ قوتیں اور قابلیتیں اور یقینیات ہیں جن کو ہر انسان اپنے اندر دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ ان میں سے نمایاں چیزوں کی طرف انگلی اٹھاتے ہیں اور ان سے جو باتیں لازم آتی ہیں ان کو پیش کرتے ہیں۔ یہ پیش کرنا کبھی تو ایسی تصریح کے

ساتھ ہوتا ہے کہ پوری بات بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے، اور کبھی تربیت کے خیال سے ایسا بھی ہوتا ہے کہ لازمی نتیجہ کی طرف صرف اشارہ کر دیا جاتا ہے تاکہ مخاطب خود اس نتیجہ تک پہنچے۔

اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ مخاطب میں صحیح نتائج نکالنے کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے، جو زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ میں اس کے کام آتی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو دوسرے کی بات سمجھ کر اس کی تردید یا انکار کے درپے نہیں ہوتا بلکہ اس کو خود اپنا نتیجۂ فکر سمجھ کر اس کو قبول کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس طرح مخاطب و متکلم میں استاد و شاگرد کے بجائے باہم گر رفیق کی نسبت پیدا ہو جاتی ہے، اور مخاطب میں یہ احساسِ کہتری نہیں پیدا ہوتا کہ میں اس نتیجہ تک دوسرے کی انگلیاں پکڑ کر پہنچا ہوں۔ بلکہ وہ خیال کرتا ہے کہ ہم دونوں مشترک طور پر اس نتیجہ تک پہونچے ہیں۔ یہ باتیں مقصد دعوت کو اتنے مختلف پہلوؤں سے فائدہ پہنچاتی ہیں کہ ان کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہ حقیقت محتاج بیان نہیں ہے کہ استدلال کی ساری قسموں میں فطرتِ انسانی سے سب سے زیادہ مناسبت رکھنے والی قسم یہی لوازم سے استدلال کی قسم ہے۔ اس وجہ سے اہلِ حق اور حضرات انبیائے کرامؑ نے اس کو سب سے زیادہ برتا ہے۔ آدمی جب ایک امر کا آفاق میں مشاہدہ کرتا ہے یا اپنی فطرت کے اندر اس کا یقین محسوس کرتا ہے تو جو باتیں اس سے لازم آتی ہیں ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ وہ صحیح ترتیب کے ساتھ اس کے سامنے پیش کی جائیں۔ اگر انکار کرے گا تو محض زبان سے انکار کرے گا۔ اس کا دل اس کے اس انکار کا ساتھ نہ دے گا، اور انکار پر اس کے لیے زیادہ دنوں تک جمے رہنا صرف اسی حالت میں ممکن ہے جب وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم ہو۔

ایک امر کے لوازم کی حیثیت اجمال کے بعد تفصیل کی ہوا کرتی ہے اور ہر آدمی سے جس میں حق پرستی اور سچائی کی کوئی رمق باقی ہے، توقع کی جاتی ہے کہ وہ جس بات پر مجملاً ایمان رکھتا ہے اس کی تفصیلات اور لوازم کو تسلیم کرنے سے بھی وہ گریز نہ کرے گا۔

جن لوگوں نے قرآن مجید کے دلائل پر غور کیا ہے وہ ہماری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کے بیشتر دلائل کی نوعیت یہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو شخص قرآن، اپنے دل کو ہر طرح کے تعصّبات سے پاک کر کے، پڑھتا ہے وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی صحیفۂ دل کی تلاوت کر رہا ہے، اور اس کی ہر صدا اسے اپنے ہی ضمیر و دل کی آواز کی طرح مانوس معلوم ہونے لگتی ہے۔

غلط مسلّمات پر بنیاد رکھنے سے احتراز

اہلِ حق اور انبیائے کرامؑ کے طرزِ استدلال کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام اہلِ مناظرہ کی طرح مخاطب کے کسی غلط مسلّمہ کو بنائے استدلال نہیں بناتے۔ اگر ایک شخص ایک غلط بات کو مان رہا ہے تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے، نہ کہ اس کی غلطی کی وجہ سے اس کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ وہ چند اور غلطیوں کو بھی تسلیم کرے۔ جو لوگ اپنے مخاطب کو صرف خاموش کر دینے کا شوق رکھتے ہیں، یا اس کو اپنی بات کے آگے جھکانا چاہتے ہیں، یا اس کو کسی مغالطہ میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں، ان کے استدلالی کارناموں میں سب سے زیادہ اہمیّت اسی چیز کو حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اہلِ حق اس چیز سے اس قدر گریز کرتے ہیں کہ اگر مخاطب کے کسی غلط مسلّمہ پر اپنے کسی حق کو بھی ثابت کر سکتے ہوں جب بھی وہ ایسا نہیں کرتے۔ ان کی نظروں میں اس حق کی کوئی وقعت نہیں ہے جس کی بنیاد کسی باطل پر ہو۔

اس طرح کا کھوکھلا اور بے اساس حق مناظرے کی مجلسوں میں ممکن ہے کچھ دیر کے لیے اپنی چمک دمک دکھا دے، لیکن زندگی کی مہمات میں یہ کچھ کام نہیں دیتا۔

زندگی کی مہمات میں صرف وہ حق کام دیتا ہے جس کی جڑیں فطرتِ انسانی کے اندر دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہوں اور اس کی وسعتوں کا یہ حال ہو کہ تمام فضا اس کے برگ و بار میں چھپ جائے۔

ہمارے متکلّمین نے بالعموم یہ غلطی کی ہے کہ اسلام کے کسی اصول کی حقانیّت ثابت کرنے کے لیے جب وہ اپنی کوئی بنیاد قائم نہ کر سکے تو انھوں نے دوسروں ہی کے کسی نظریہ اور واہمہ کو اساس بنا کر اسی پر اپنے مزعومات کی عمارت کھڑی کر دی۔ اس طرح کی غلط وکالت سے اسلام کو جو نقصان پہنچا ہے اس قدر اسلام کے مخالفین کی مخالفتوں سے اس کو نہیں پہنچا۔ اسلام کے کسی اصول کو صحیح عقلی و فطری دلائل سے نہ ثابت کر سکنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ خدانخواستہ اسلام اپنے اصولوں کی سچّائی کے عقلی و فطری دلائل رکھتا ہی نہیں، بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ حضرات غیر فطری عقلیات سے اپنا مذاق اس قدر بگاڑ چکے تھے کہ اسلام کی عقلیّت کی قدر و قیمت کو یہ پہچان ہی نہیں سکتے تھے۔ ایسی صورت میں ان کے لیے صحیح راہ یہ تھی کہ خواہ مخواہ کو اسلام کی وکالت کا بیڑا نہ اُٹھاتے۔ بلکہ اپنے جن دھندوں میں مشغول تھے انھیں میں مشغول رہتے، لیکن دینِ آبا ہونے کی حیثیت سے اسلام کے لیے ان کے دلوں میں جو عصبیت تھی وہ انھیں اکساتی تھی کہ وہ جس دین کا نام لیتے ہیں عقلی اصولوں پر اس کی سچّائی بھی ثابت کریں۔ اسلام کی عقلیت ان کے فسادِ مذاق اور قرآن سے محرومی کی وجہ سے ان کے دلوں کو اپیل نہیں کرتی تھی، اس وجہ سے انھوں نے چاہا کہ اس کو اسی عقلیّت کے معیار پر پورا ثابت کر دکھائیں۔ جو ان کے زمانوں میں مقبولِ عام و خاص ہے۔ ان کی اس غلط کوشش کا یہ نتیجہ ہوا کہ اسلام کی محکم اور سچّی تعلیمات کی ساری عمارت اس کی اپنی چٹان سے زیادہ مضبوط بنیادوں سے ہٹا کر بالکل کمزور اور پھس پھسی بنیادوں پر کھڑی کر دی ہے۔

ان حضرات نے یہ کوشش کتنی ہی نیک نیتی سے کی ہو لیکن اس کے

نتائج نہایت خطرناک نکلے، زمانہ کے امتداد اور سائنس کے اکتشافات نے جب وہ نظریات بے حقیقت ثابت کر دیے جو کل تک مقبولِ عام تھے تو اس کی زد لازماً اسلام کے ان اصولوں پر بھی پڑی جن کو ان غلط نظریات پر ڈھالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے سبب سے اسلام کے متعلق بہتوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جس طرح وہ نظریات پرانے ہو گئے، اسی طرح اسلام بھی پرانا ہو گیا، یہ سوئے ظن پیدا کرنے میں جس طرح ہمارے پرانے متکلمین نے حصّہ لیا ہے اسی طرح ہمارے نئے متکلمین نے بھی اس میں حصّہ لیا ہے اور ان دونوں گروہوں کی مشترک غلطی یہی ہے کہ حق کی حمایت کے لیے انھوں نے حق کو کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کے لیے باطل کا تعاون ضروری سمجھا۔ حالانکہ حق کے معنی ہی یہی ہیں کہ وہ ثابت اور محکم ہے اور عقل و فطرت کے اندر اس کی جڑیں نہایت دور تک پھیلی ہوئی ہیں لیکن ہمارے متکلمین یونانیوں کے بنائے ہوئے طریقۂ فکر و استدلال کے اتنے خوگر ہو چکے تھے کہ وہ قرآنی طرزِ استدلال کی باریکیوں اور خوبیوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ حالانکہ اگر وہ استدلال کی ان خلافِ فطرت روشوں کو چھوڑ کر قرآن اور پیغمبر کے حکیمانہ طرزِ استدلال کو سمجھنے کی کوشش کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ قرآن کے ہر دعوے کی بنیاد ایسے محکم دلائل پر قائم ہے جو زمان و مکان کی تمام قیود و حدود اور انقلابِ آراء و افکار کی تمام اثر اندازیوں سے بالکل آزاد ہیں۔

قدرِ مشترک کی تلاش

داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اور مخاطب کے درمیان قدرِ مشترک تلاش کر کے اس کو بنائے بحث و استدلال بناتے ہیں۔ ہر گوشہ میں خواہ مخواہ اپنی انفرادیت اور یکتائی کے اظہار کی کوشش نہیں کرتے۔ نوعِ انسانی اپنے ظاہری اختلافات کے لحاظ سے کتنی ہی بے میل اور کتنی ہی متفرق اور پراگندہ کیوں نہ نظر آئے لیکن اس کے اس تفرق اور پراگندگی کی تہ میں بے شمار اصول و عقائد ایسے بھی ہیں جن میں

سب متحد ہیں آفاق کے قوانین و ضوابط، تاریخ کے مسلمات، فطرت کے یقینیات اور بنیادی اخلاقیات میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں شرق و غرب اور عرب و عجم سب ایک ہی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اگر ان کو بحث و استدلال کی اساس قرار دیکر اس بات کی سعی کی جائے کہ منطقی طور پر ان اصولوں سے جو باتیں لازم آتی ہیں لوگ ان میں بھی متفق اللفظ ہوجائیں تو یہ بات ان لوگوں کو اپیل کرتی ہے جو نیک نیت اور سلیم الفطرت ہوتے ہیں زندگی کے جو اصول مشترک ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے لوازم میں جو اختلاف ہوا کرتا ہے وہ اکثر سوءِ فہم اور تقلید سے پیدا ہوا کرتا ہے، اور کوشش کرکے اگر اس کو دُور کر دیا جائے تو ہر شخص ان اصولوں کو مشترک ورثہ ہی کی حیثیت سے قدر و عزّت کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے۔

حضرات انبیائے کرامؑ نے ہمیشہ یہی طریقہ استدلال و حجّت کے لیے اختیار کیا ہے، عرب کے مشرکین اور اہلِ کتاب پر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اتمامِ حجّت فرمایا ہے اس کی تمام تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے کہیں یہ گمان بھی نہیں گزرتا کہ ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جو ان کے لیے بالکل نادر اور انوکھی ہو، اور ان کی تاریخ، ان کی روایات، ان کے معروف و منکر اور ان کے عقائد و اخلاق میں اس کی اصل موجود نہ ہو، اختلاف جو کچھ نظر آتا ہے وہ صرف اصول کی تعبیر اور ان کے لوازم و نتائج میں نظر آتا ہے، اور اسی کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مطالبہ تھا کہ اصول و جزئیات میں جو تناقص پیدا ہوگیا ہے لوگ اس کو دُور کرلیں۔ اگر وہ بات حق ہے جو قرآن مجید کہہ رہا ہے تو اس کو مان لیں اور اگر وہ بات حق ہے جس کے وہ مدعی ہیں تو اس کو صحیح ثابت کردیں۔

اس طرزِ استدلال کا فائدہ یہ ہے کہ داعی کے متعلق یہ بدگمانی نہیں پیدا ہوتی کہ یہ کوئی ایسا شخص ہے جو اپنی انفرادیت کے زعم میں تمام ماضی پر خطِ نسخ پھیرنا چاہتا ہے۔

اور اپنی شخصیّت کا سکّہ جمانے کے خبط میں مبتلا ہے، بلکہ یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہمارے ہی اگلوں کا ورثہ ہماری طرف منتقل کرنے آیا ہے۔ اور اگر کچھ لوگ شرارت کی وجہ سے بدگمانیاں پھیلانا بھی چاہتے ہیں تو زیادہ عرصہ تک نہیں پھیلا سکتے۔ اصل حقیقت کا آفتاب نمودار ہوکر بہت جلد ان ظلمتوں کو کافور کر دیتا ہے۔

جو لوگ اہل حق کے اس طرز استدلال کی خوبیوں اور فوائد سے واقف نہیں ہیں، ان کا طرزِ عمل بالعموم اس کے بالکل ضد ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ قدرِ مشترک تلاش نہیں کرتے بلکہ جو قدرِ مشترک انھیں ملتا بھی ہے اسے بھی نقطۂ اختلاف بنا کے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کے استدلال اور ان کی دعوت کی اصل خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ وہ یہ ثابت کرسکیں کہ دنیا کے کان اب تک اس سے بالکل ناآشنا رہے ہیں، اور آسمان کے نیچے بالکل پہلی مرتبہ انھوں نے اس کو آشکارا کیا ہے۔

ہمارے مناظرین جو اسلامی دعوت کے صحیح مزاج سے واقف نہیں ہیں وہ بالعموم اسی طرح کے خبط میں مبتلا ہیں۔ وہ اسلام کی کسی حقیقت کو جب بھی پیش کرتے ہیں اس کا اصلی کمال اسی بات میں سمجھتے ہیں کہ اس کو ایک نادر ترین حقیقت ثابت کر دکھائیں۔ یہ چیز قدرتی طور پر طبائع میں اُنس کے بجائے اس سے بیزاری پیدا کرتی ہے اور لوگ بجائے اس کے کہ اُسے اپنی چیز سمجھ کر اس کا شوق کریں، اسے اجنبی چیز سمجھ کر اس سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں۔

الزامی طریقِ استدلال سے احتراز

داعیانِ حق کے طرزِ استدلال کی پانچویں خصوصیّت یہ ہے کہ وہ الزامی طریقِ استدلال و جواب کبھی اختیار نہیں کرتے۔ الزامی طریقِ استدلال سے ہماری مراد وہ نہیں ہے جس کو ہم اوپر استدلال باللوازم کے عنوان سے ذکر کر چکے ہیں بلکہ اس سے ہمارا اشارہ ہمارے مناظرین و متکلمین حال کے اس غلط طریقہ کی طرف ہے جو عموماً وہ موجودہ

معترضین اور نکتہ چینوں کے مقابل میں اسلام کی حمایت کے لیے اختیار کرتے رہے ہیں، ان کا مقبول عام طریقہ یہ ہے کہ جہاں کسی مذہب والے نے اسلام کی کسی بات پر اعتراض کیا وہ جھٹ اسی قبیل کی مثالیں حریف کے مذہب کی تعلیمات کے اندر پیش کرنا شروع کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے اسلام کو اعتراض کی زد سے محفوظ کر لیا۔ حالانکہ یہ طریقہ، جواب اصولی طور پر غلط ہے۔ دوسرے کی کسی غلطی کی بنا پر ہماری کسی غلطی کا حق ہونا تو الگ رہا، ہمارے کسی حق کا حق ہونا بھی مشتبہ ہو جاتا ہے۔

اس طریق استدلال کا فائدہ اگر کوئی ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معترض چپ ہو جایا کرتا ہے، اور اس سے ہمارے غرورِ نفس کو تسلّی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس سے نہ تو مخالف کو اسلام کی حقّانیت کا ثبوت ملتا نہ خود اپنے آپ کو اس سے شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ یہ اُلٹے اپنی ہی کمزوری کا نہایت کُھلا ہوا ثبوت ہے، جو ہم خود اپنی زبان سے دوسروں کے لیے بہم پہنچاتے ہیں۔ ہر امر حق اپنی دلیل خود اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کی دلیل دوسروں کے کسی باطل کے اندر نہیں ہوا کرتی۔ اس وجہ سے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اس کے دلائل خود اس کے اندر سے پیش کئے جائیں۔ اس معاملہ میں ہمارے متکلّمین کی روش غلط ہونے کی دو وجوہ ہیں۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مخالفین کے پروپیگنڈے سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے بسا اوقات اسلام کے بعض نہایت سچّے اصولوں کی سچّائی خود ان کی اپنی نظروں میں مشتبہ ہو گئی، اور انھیں ان کی حمایت کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نظر نہیں آیا کہ الزامی طریق جواب اختیار کر کے مخالف کو چپ کریں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان حضرات نے اپنی وکالت و حمایت کی ذمہ داری صرف اسلام ہی کی حد تک محدود نہیں رکھی بلکہ قومی تعصّب کی وجہ سے انھوں نے مسلمان قوم کی پوری تاریخ کی حمایت بھی اپنے سر لے لی۔ جس کی وجہ سے ان کا محاذِ جنگ بہت لمبا

ہو گیا اور انھیں بہت سی ایسی چیزوں کا حق ہونا بھی ثابت کرنا پڑا جن کو حق ثابت کرنا اس وقت تک ممکن ہی نہیں تھا جب تک وہ دوسروں کے بہت سے باطل کو بھی حق ثابت نہ کردیں۔ ہمارے متکلمین کا وہ سارا لٹریچر جو گذشتہ نصف صدی کے اندر تیار ہوا ہے اور جس میں جہاد، غلامی، تعددِ ازدواج، طلاق اور مسلمان سلاطین کے کارناموں کے جواز وغیرہ پر بحث کی گئی ہے وہ تمام تر اسی صورتِ حال کی شہادت ہے اس کو پڑھ کر کبھی تو ان حضرات کی مرعوبیت اور بے بسی پر افسوس ہوتا ہے اور کبھی ان کی غلط روی پر سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے، حالانکہ اگر وہ پروپیگنڈے سے مرعوب نہ ہوتے اور خواہ مخواہ کو پرائے جھگڑے اپنے سر نہ لے لیتے بلکہ اپنی حمایت صرف اسلام ہی تک محدود رکھتے، تو ان بہت سی بوالفضولیوں سے بالکل محفوظ رہ جاتے جن میں ان کو چار و ناچار مبتلا ہونا پڑا، اور جن کی وجہ سے وہ اسلام کی خدمت کرنے کے بجائے اس کی دعوت کی راہ میں بہت سے کانٹے بو گئے جو ایک ایک کر کے آج ان لوگوں کو چننے پڑیں گے جو اس راہ میں قدم رکھنا چاہیں گے۔

مخاطب کی نفسیات کا لحاظ

جس طرح ایک بیج کے نشو و نما پانے کے لیے تنہا بیج کی صلاحیتوں ہی پر نظر نہیں رکھنی پڑتی بلکہ زمین کی آمادگی و مستعدی اور فصل و موسم کی سازگاری و موافقت کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح کلمۂ حق کی دعوت میں مجرّد حق کی فطری صلاحیتوں پر ہی اعتماد نہیں کر لینا چاہئے۔ بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ جن لوگوں کے سامنے وہ حق پیش کیا جا رہا ہے، دعوت کے وقت نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان کی حالت کیا ہے؟

زمینوں کی طرح روحوں اور دلوں کے موسم بھی ہوتے ہیں اور ایک داعی کا فرض ہے کہ ان موسموں سے اسی طرح واقف ہو جس طرح ایک دہقان زمین کی فصلوں اور موسموں کو پہچانتا ہے اور اسی وقت کوئی بیج ڈالے جب موسم سازگار ہو، جو لوگ اس اصول کی خلاف ورزی کرتے ہیں، خواہ اپنی سادگی اور بھولے پن کی وجہ سے، یا اس خیال سے کہ حق اپنے ذاتی جوہر اور اپنی فطری کشش سے خود بخود دلوں میں جگہ پیدا کر لے گا، اس کے لیے کسی اہتمام کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنی اس غلطی کی سزا اپنی دعوت کی ناکامی کی شکل میں پاتے ہیں، اور ان کی نیک نیتی ان کی اُس بے تدبیری اور غفلت کے نتائج سے ان کو بچا نہیں سکتی جو مخاطب کی نفسیات کی رعایت کے باب میں ان سے صادر ہوتی ہے۔

نفسیاتِ مخاطب کی رعایت کے دس اصول

ایک داعی کو جن مختلف قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور ان سے ان کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھ کر جتنے مختلف نوعیت کے معاملے اس کو کرنے پڑتے ہیں ان سب کی تفصیل نہ ممکن ہی ہے اور نہ اس کے لیے یہاں گنجائش ہی ہے۔ لیکن حضرات انبیائے کرامؑ کے طرزِ عمل سے، یا ان ہدایات سے جو ان کو اس بارے میں دی گئی ہیں۔ بعض اصولی باتیں مستنبط ہوتی ہیں، جو بطورِ مثال ہم یہاں بیان کریں گے، تاکہ ان کو پیشِ نظر رکھ کر لوگ از خود ان سے مزید اصول مستنبط کر لیں۔ اس چیز کا تعلق درحقیقت عام انسانی فہم سے ہے۔ ایک سلیم الطبع اور نیک نیت داعی، جو اپنے مقصد کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔ اگر ان مثالوں کو پیشِ نظر رکھے گا تو ہمیں امید ہے کہ بہت جلد وہ اپنے طریقِ دعوت کو انبیاء کے طریقِ دعوت سے مشابہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

یہاں ہم جن اصولی باتوں کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں وہ دس ہیں:

پہلا اصول ۱۔ ایک ہی چیز کے مختلف پہلو ہوا کرتے ہیں۔ بعض اعتبار سے وہ سہل و آسان ہوتی ہے۔ بعض اعتبار سے مشکل ہوتی ہے۔ کسی مبتدی کے سامنے اگر اس کو اس پہلو سے پیش کیجیے جو سہل ہے تو اس کو اس سے کچھ ایسی اجنبیت اور نفرت نہیں ہو گی۔ لیکن اگر پہلی ہی ملاقات میں، اس کو دوسرے پہلو سے پیش کر دیجیے تو وہ فوراً اس سے وحشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہو گا۔ اور پھر شاید کبھی اس کے پاس بھی نہیں پھٹکے گا۔ دینِ حق کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ بیگانہ سے بیگانہ آدمی کے لیے بھی وہ اپنے بعض پہلوؤں سے دل آویز اور دل کش ہے، اور اگر اسی پہلو سے اس کو اس کے سامنے پیش کیا جائے تو آہستہ آہستہ وہ اس سے مانوس ہو کر اس کے نرم و سخت کو قبول کر لیتا ہے، لیکن مانوس سے مانوس آدمی بھی اس کے بعض پہلوؤں کو سخت اور گراں محسوس کرتا ہے اور اگر اس کے سامنے اسی پہلو سے اس کو پیش کیا جائے تو

مزید مانوس ہونا تو الگ رہا، اندیشہ اس بات کا رہتا ہے کہ کہیں اس کا سابق اُنس بھی وحشت و اجنبیت سے نہ بدل جائے۔ جو لوگ ایک شئے کے مختلف پہلوؤں اور ان کے فرق کو نہیں جانتے، یا اس بات سے واقف نہیں ہیں کہ ایک مبتدی کے سامنے ایک شئے کا کون سا پہلو سب سے پہلے لانا چاہیے۔ یا طبعاً اُن کا مذاق ہی اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ سنگلاخ زمینوں ہی میں طبع آزمائی کرتے اور ہر بات میں تشدد ہی کو کمالِ دین داری خیال کرتے ہیں۔ وہ لوگ جب دعوتِ دین کا کام سنبھالتے ہیں تو ان کی دعوت کا نتیجہ بالعموم یہی ہوتا ہے کہ لوگ قریب آنے کے بجائے اور زیادہ دُور ہو جاتے ہیں، اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتی کہ یہ لوگ دعوت کے لیے جو راہ اختیار کرتے ہیں وہ انسانی نفسیات کے لحاظ سے بالکل اُلٹی ہوتی ہے۔ اس سے بشارت کی جگہ نفرت اور انس کی جگہ بے زاری پھیلتی ہے۔ اسی چیز سے روکنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا (خوشخبری دو، لوگوں میں نفرت نہ پھیلاؤ) اور داعیانِ حق کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ بتایا ہے کہ انما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین (تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو)۔

دوسرا اصول | نفسیاتی نقطۂ نظر سے دوسری اہم چیز ایک داعی کے لیے قابلِ لحاظ یہ ہے کہ اُسے کسی حال میں بھی اپنے مخاطب کے اندر حمیتِ جاہلیت کے بھڑکنے کا موقع نہیں پیدا ہونے دینا چاہیے۔ ہر داعی حق کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر قوم اپنے معتقدات و روایات کے ساتھ کم و بیش اسی طرح کی وابستگی رکھتی ہے جس طرح کی وابستگی ایک داعئ حق اپنے معتقدات کے ساتھ رکھتا ہے، یہ وابستگی اگر باطل ہے تو اس کی اصلاح کا راستہ یہ ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے جن کی وجہ سے یہ غلط وابستگی قائم ہے، اور ان کی اصلاح کو اس

وابستگی کے توڑنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ حق پرستی کے جوش کے یا باطل کی مخالفت کے جذبے سے مغلوب ہوکر یہ ہرگز نہ کیا جائے کہ اس غلط وابستگی کے فکری اسباب کی اصلاح کے بجائے خود اسی پر براہِ راست حملہ کردیا جائے۔ اس طرح کے براہِ راست حملہ کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ مخاطب حمیّتِ جاہلیت کے جوش سے بے خود ہوکر دعوت کی مخالفت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور اس جوش میں وہ ایسا اندھا بہرا ہوجاتا ہے کہ جس اینٹ پتھر پر اس کا ہاتھ پڑ جاتا ہے وہی اُٹھا کر وہ داعی پر پھینک مارتا ہے۔ سورۂ انعام میں داعیانِ حق کو اسی چیز سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ	اور تم گالی نہ دو ان کو جن کو یہ اللہ کے
مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ	سوا پوجتے ہیں کہ وہ حد سے گزر کر بے
عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ كَذَٰلِكَ زَيَّنَّا	جانے بوجھے اللہ کو گالی دے بیٹھیں
لِكُلِّ أُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ۔	ایسے ہی ہم نے ہر امّت کی نظروں میں
(انعام، ۱۰۸)	ان کے اعمال کھپا دیئے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک ہدایت قرآن مجید نے یہ بھی دی ہے کہ دعوتِ حق کے کام کے سلسلے میں ساری گفتگو اصل مقصد تک محدود رہنی چاہیے۔ اگر مخاطب کی طرف سے کوئی ایسا پہلو چھیڑ دیا جائے جس سے دونوں فریق کے مقتداؤں اور لیڈروں سے ترجیح و تفصیل کا معرکۂ کارزار گرم ہوجانے کا اندیشہ ہو تو داعیانِ حق کو چاہیئے کہ بحث کی غلط رو میں بہہ جانے کی بجائے اس کو صحیح رُخ پر لانے کی کوشش کریں اور مخاطب کے لیڈروں اور مقتداؤں کی تحقیر کے بجائے ان کے لیے اس عزّت و احترام کا اعتراف کریں جس کے وہ واقعی طور پر مستحق ہیں:

وَقُلْ لِعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي	اور میرے بندوں سے کہو وہ بات کہیں
هِيَ أَحْسَنُ ۚ إِنَّ الشَّيْطَانَ	جو بہتر ہے، شیطان ان کے درمیان

يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ إِنَّ الشَّيْطَانَ	وسوسہ اندازی کرتا رہتا ہے۔ بیشک
كَانَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○	شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے تمہارا
رَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِكُمْ إِنْ يَّشَأْ	رب تم کو خوب جانتا ہے، اگر چاہے گا
يَرْحَمْكُمْ وَإِنْ يَّشَأْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ	تم پر رحم کرے گا اور اگر چاہے گا تم کو عذاب
وَمَا أَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ○	دے گا، اور ہم نے تم کو ان کے ایمان
وَرَبُّكَ أَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ	کا ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے اور تیرا رب
وَالْأَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ	خوب جانتا ہے ان کو جو آسمان اور
النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ	زمین میں ہیں اور ہم نے بعض نبیوں
زَبُوْرًا ○	کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے

بنی اسرائیل ۵۳، ۵۵) داؤد کو زبور دی ہے۔

اس ہدایت کا مقصد بھی یہی ہے کہ داعیٔ حق کو ان تمام باتوں سے احتراز کرنا چاہیئے جو عصبیتِ جاہلیت کو بھڑکانے والی اور مخاطب کو عناد و اختلاف کی راہ پر ڈال دینے والی ہوں۔

تیسرا اصول :۔ جو لوگ عزت و پیشوائی کے مقام پر سرفراز رہتے چلے آنے کی وجہ سے دوسروں کی طرف سے اپنے لیے خطاب و کلام میں تعظیم و تکریم کے خوگر ہو چکے ہوں اور اندیشہ ہو کہ اس کی خلاف ورزی سے ان کے پندارِ نفس کا شیطان جاگ اُٹھے گا اور ان کو حق بات سننے سے روک دے گا، داعی کو چاہیے کہ ایک خاص حد تک ان کی اس بیماری کا لحاظ رکھے، تاکہ قبولِ حق میں ان کے اپنے نفس کی مزاحمتوں کے سوا داعی کی طرف سے کوئی جدید مانع نہ پیدا ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی پہلو سے ہدایت کی گئی کہ :۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﺝ	فرعون کے پاس جاؤ، وہ سرکش ہو گیا ہے

فَقُوْلَا لَہٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّہٗ یَتَذَکَّرُ اَوْ یَخْشٰی ○ (۴۴، طٰہٰ)
اور اس سے نرمی سے بات کرو تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کرے یا ڈرے۔

لیکن یہ لحاظ اسی حد تک جائز ہے جہاں تک اس حق کے احترام و وقار کے خلاف نہ ہو جس کو داعی پیش کر رہا ہے۔ اگر یہ لحاظ کسی پہلو سے حق کے وقار کو صدمہ پہنچائے تو پھر یہ جائز نہیں ہے۔ قرآن میں صراحت کے ساتھ اس کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

چوتھا اصول: جس طرح ایک ماہر طبیب مریض کی عمر اس کے مزاج اور اس کے مرض کی شدّت و خفّت کے لحاظ سے اس کے لیے دوا کی خوراک تجویز کرتا ہے۔ اسی طرح ایک داعیٔ حق کا بھی فرض ہے کہ وہ مخاطب کی استعداد، اس کی طلب اور اس کے ظرف کے لحاظ سے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ اس چیز کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لیے صرف مخاطب کی نوعی استعداد اور نوعی قابلیتوں ہی کو سامنے نہیں رکھنا چاہیے۔ بلکہ اس کی قومی خصوصیّات اور اس کے انفرادی حالات کا لحاظ بھی ضروری ہے ان چیزوں کا لحاظ کیے بغیر کسی دعوت کی کامیابی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

یہی چیز ہے جس کی وجہ سے قرآن مجید مختلف اوقات میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰہُ لِتَقْرَاَہٗ عَلَی النَّاسِ عَلٰی مُکْثٍ وَّنَزَّلْنٰہُ تَنْزِیْلًا (اور ہم نے قرآن کو مختلف وقتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا تاکہ تو لوگوں کے سامنے اس کو ٹھہر ٹھہر کے پیش کرے اور ہم نے اس کو اہتمام کے ساتھ اُتارا) اسی طرح قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی دعوت میں بہت سی باتیں عربوں کے افتادِ مزاج کے لحاظ سے اختیار کی گئیں۔

مثلاً چونکہ وہ ضدّی اور جھگڑالو (قَوْمًا لُّدًّا) تھے اس وجہ سے ان سے بحث و مناظرہ کا وہ طریقہ اختیار کیا گیا جو ایک جھگڑالو اور ضدّی قوم کے لیے موزوں تھا۔ نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیہات سے آنے والے لوگوں کے سامنے دینِ حق کو جس

انداز سے پیش فرماتے تھے وہ اس سے بالکل مختلف ہوا کرتا تھا۔ جس انداز سے آپؐ مکہ اور مدینہ کے شہریوں کو دعوت دیتے تھے۔

وفد عبد القیس نے آپؐ سے شکایت کی کہ ہمارے اور آپؐ کے درمیان قریش کا قبیلہ حائل ہے اور ان کی دشمنی کی وجہ سے اشہرِ حُرُم کے سوا اور مہینوں میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکتے۔ اس وجہ سے آپؐ ہمیں کچھ ایسی اصولی باتیں بتا دیجئے جنھیں ہم خود بھی اختیار کر سکیں، اور ان کی دعوت دوسروں کو بھی دے سکیں۔ آپؐ نے ان کی ضرورت اور حالت کو سامنے رکھ کر صرف چار چیزوں کی ممانعت فرمائی اور فرمایا کہ اپنی قوم کے لوگوں کو ان چار چیزوں کا حکم دو اور ان چار چیزوں سے روکو۔ اس سے زیادہ تفصیل آپؐ نے ان کے سامنے نہیں رکھی۔

ظاہر ہے کہ طریقِ دعوت کا یہ فرق محض ان جماعتوں کی نفسیات کے اختلاف کی بنا پر تھا۔ جن کا اختلاف معمولی اور جن کی الجھنیں سادہ تھیں، تاکہ وہ ان پر عمل کریں۔ اس کے برعکس جو لوگ گہری الجھنیں رکھتے تھے ان کے ذہنوں کو صاف کرنے کے لیے ایک مناسب ترتیب کے ساتھ لگاتار دعوت دی جاتی تھی۔

پانچواں اصول: جس طرح ایک دہقان کے لیے زمین کی تیاری اور موسم کی سازگاری کے بغیر بیج ڈال دینا جائز نہیں ہے۔ اور جس طرح ایک طبیب کو مرض کے بحران کی حالت میں مریض کو دوا دینے سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک داعیٔ حق کو ان تمام اوقات میں دعوت دینے سے احتراز کرنا چاہیے۔ جب مخاطب اعتراض اور نکتہ چینی کی طرف مائل ہو، نہ صرف اس حالت میں دعوت پیش کرنے سے احتراز ضروری ہے، بلکہ اگر دعوت کو پیش کرنے کے بعد بھی مخاطب پر اعتراض و نکتہ چینی کا دورہ پڑ جائے تو داعی کو چاہیئے کہ بحث کو بڑھانے کے بجائے اس کو وہیں ختم کر کے ہٹ جائے اور کسی اور مناسب موقع کا انتظار کرے، جب مخاطب خالی الذہن

یا کم از کم اعتراض و نکتہ چینی کے رجحان سے خالی ہو۔

إِذَا رَأَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ	جب دیکھو ان لوگوں کو جو ہماری آیات
فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى	پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان سے
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ ۭ وَ	اعراض کرو، یہاں تک کہ وہ کسی اور بات
اِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا	میں لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ	یہ بات فراموش کرا دے تو یاد آنے کے
الظّٰلِمِيْنَ ۔ (۶۸، انعام)	بعد ظالموں کے ساتھ نہ بیٹھو۔

اس صریح ممانعت کے ہوتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے علماء نے تبلیغِ دین کے لیے مناظرہ کے طریقہ کو کیسے جائز سمجھا، جس میں دونوں فریق اکٹھے ہی اس مقصد سے ہوتے ہیں کہ اپنے حریف کی تردید و تکذیب کریں گے، اگرچہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو۔ جن لوگوں کو مناظرہ کی مجالس کا کچھ تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ ان مجالس سے صرف اس "خوض" (موشگافی) کے شوق کو شہ ملتی ہے جس کی نسبت قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ اس کی بو محسوس کرتے ہی داعیٔ حق کو دامن جھاڑ کے اٹھ جانا چاہیئے، لیکن ہمارے مناظرین کو یہ بو اس قدر مرغوب رہی ہے کہ جس قدر یہ بڑھی اسی قدر ان کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا۔

چھٹا اصول: اسی طرح ان مواقع سے داعی کو احتراز کرنا چاہیے جب مخاطب اپنی کسی ایسی دلچسپی میں منہمک ہو کہ جس کو چھوڑ کر دعوتِ حق کی طرف متوجہ ہونا اس کی طبیعت پر گراں گزرے۔ اگرچہ یہ حالت پہلی حالت سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس میں عناد و اختلاف کا جذبہ شامل نہیں ہے۔ لیکن مخاطب کی طبیعت کی عدم مستعدی کے اعتبار سے دونوں حالتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

عن عکرمۃ ان ابن عباس	عکرمہؓ سے روایت ہے کہ ابن عباسؓ
قال حدِّثِ النّاسَ کل جمعۃٍ	نے کہا کہ لوگوں کو جمعہ جمعہ وعظ کیا کرو،
مرۃ فِانْ اَبَیْتَ فَمرتین	اگر اس سے زیادہ ہو تو ہفتہ میں دوبار
فان اکثرت فثلاث ولا	اگر اس سے بھی زیادہ کرنا چاہو تو تین
تملّ النّاس ھذا القرآن	بار اور لوگوں کو اس قرآن سے بیزار
ولا الفینك تاتی القوم وھم	نہ کرو، اور ایسا ہرگز نہ ہو کہ تم لوگوں کے
فی حدیث من حدیثھم	پاس ایسے وقت میں آؤ جب وہ اپنی
فتقص علیھم فتملھم ولکن	کسی اور دلچسپی میں ہوں اور اس وقت
انصت فاذا امروك فحدثھم	ان کو وعظ سنانا شروع کردو اور
وھم یشتھونہ۔	اس کا نتیجہ بیزاری ہو ایسے موقع پر خاموش

رہو، یہاں تک کہ لوگ تم سے خواہش کریں، تو ان کو سناؤ تاکہ تمہارا وعظ وہ رغبت سے سنیں۔

ساتواں اصول: داعی کے لیے اس امر کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی خشکی و یک رنگی، اس کی بے ضرورت تکرار، اور اس کے بے فائدہ طولِ بیان سے سننے والے بدحظ اور بے زار نہ ہونے پائیں:

عن شقیق قال کان عبد اللہ	شقیق سے روایت ہے کہ عبداللہ بن
بن مسعود یذکر النّاس فی	مسعود ہر جمعرات کو وعظ کہا کرتے تھے
کل خمیس فقال لہٗ رجل یا	ایک شخص نے ان سے کہا کہ اے ابو
اباعبد الرحمٰن لوددت	عبدالرحمٰن (عبداللہ بن مسعود کی کنیت ہے)
انّك ذکرتنا فی کل یوم قال	میری خواہش ہے کہ آپ روزانہ وعظ فرمایا
اما انہ یمنعنی من ذلك الی	کریں، انھوں نے جواب دیا کہ میں ایسا صرف

اکرہ ان املکم وانی اتخولکم بالموعظۃ کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بہا مخافۃ السآمۃ علینا۔ (متفق علیہ)	اس خیال سے نہیں کرتا کہ کہیں تم بیزار نہ ہو جاؤ، میں بھی اسی طرح ناغہ کرکے تمہیں نصیحت کرتا ہوں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ناغہ کرکے نصیحت کیا کرتے تھے تاکہ ہم بیزار نہ ہونے پائیں۔

یہ سطریں لکھتے وقت ہمارے سامنے ان واعظین اور ان کے بد قسمت اور مظلوم سامعین کی ایک تصویر سامنے آگئی جن کی وعظ گوئی کا سب سے بڑا ہنر ان کا لا یعنی طولِ کلام ہوتا ہے، جو اتنی موٹی سی بات سے بھی واقف نہیں ہیں کہ بہتر سے بہتر بات بھی بے ضرورت بار بار دہرانے سے ناگوار بن جایا کرتی ہے۔ اور وعظ سنانے کے لیے لوگوں کے پیچھے پڑ جانے سے نہ صرف یہ کہ دعوتِ دین کے مقصد کو کوئی فائدہ نہیں پہونچتا بلکہ اُلٹے اس سے شدید نقصان پہونچتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ لوگوں کو وقفہ وقفہ کے ساتھ نصیحت فرمایا کرتے تھے تاکہ لوگ بد حظ نہ ہونے پائیں۔ آپ کے خطبے نہایت مختصر ہوا کرتے تھے۔ نیز روایات میں آتا ہے کہ آپ کی ہدایت تھی کہ: "جب نصیحت کرو تو مختصر کرو"۔ اور بعض روایات میں خطبہ کے اختصار کو خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیتے ہوئے آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "بعض خطبے جادو ہوتے ہیں"۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خطبے مختصر اور جامع و بلیغ ہونے چاہئیں کہ جادو کی طرح دلوں پر اثر کریں نہ کہ سننے والے کی طبیعت کو کند کریں، کہ اس میں کسی بات کو سننے اور اس کو قبول کرنے کی کوئی صلاحیت ہی باقی نہ رہ جائے۔

آٹھواں اصول :۔ ایک داعیٔ حق کو اپنے گرد و پیش کا پوری ہوشیاری و مستعدی کے ساتھ جائزہ لیتے رہنا چاہیے کہ دعوت کی تخم ریزی کے لیے کب کوئی موزوں

موقع ہاتھ آتا ہے، اور جوں ہی وہ محسوس کرے کہ اس کے مقصد کے لیے کوئی موقع پیدا ہو گیا ہے، بغیر کسی توقف کے اسے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کی بہترین مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے اسوہ میں ملتی ہے:

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيَانِ ط قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ج وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّیْٓ اَرٰىنِیْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِیْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ط نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ج اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ○ قَالَ يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ط ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ط اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ط مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ط ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ○ يٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○

اور اس کے ساتھ دو نوجوان قید خانے میں داخل ہوئے، ایک نے کہا "میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں" دوسرے نے کہا "میں دیکھتا ہوں کہ اپنے سر پر روٹیوں کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہوں جس میں سے چڑیاں کھا رہی ہیں، ہمیں اس کی تعبیر بتائیے، آپ نہایت بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں"۔ یوسفؑ نے کہا "جو کھانا تمہیں ملتا ہے اس کے ملنے سے پہلے میں اس کی تعبیر تمہیں بتا دوں گا" یہ ان باتوں میں سے ہے جس کی تعلیم مجھے میرے رب نے دی ہے میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی تھی اور وہ آخرت کی بھی منکر تھی اور میں نے پیروی کی اپنے باپ ابراہیمؑ، اسحٰقؑ، اور یعقوب کی ملت کی، ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم کسی

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ
اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ
مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا
تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ
الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ يٰصَاحِبَيِ
السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ
خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ
فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ
الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۔

(۳۶، ۴۱ - یوسف)

چیز کو اللہ کا شریک ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے اوپر فضل ہے، لیکن اکثر لوگ اس کی شکرگزاری نہیں کرتے، اے میرے قیدخانہ کے دونوں ساتھیو! کیا بہت سے رب بنانا بہتر ہے یا ایک اللہ واحد قہار کو؟ اس کے سوا نہیں تم پوجتے ہو مگر چند ناموں کو، جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں جن کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اُتاری ہے، اللہ کے سوا کسی کو فیصلہ کا اختیار نہیں ہے اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، یہی فطری دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اے میرے قیدخانہ کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا، باقی رہا دوسرا تو اس کو سولی ہوگی اور چڑیاں اس کے سر کو نوچیں گی تو اس بات کا فیصلہ ہوگیا جس کو تم دریافت کر رہے تھے۔

اس پر ایک نظر ڈال کر واقعہ کی پوری تصویر تجسیمِ تصور کے سامنے لائیے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ دو آدمی جیل میں داخل ہوئے ہیں، دونوں خواب دیکھتے ہیں، انھیں خواب کی تعبیر معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ قیدخانہ کے آدمیوں میں ہر اعتبار سے حضرت یوسف علیہ السلام ایسے آدمی ان کو نظر آتے ہیں جن کی طرف اس غرض کے لیے وہ رجوع کر سکتے ہیں۔ چنانچہ حُسنِ عقیدت و احترام کے جذبہ کے ساتھ اپنے خواب وہ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس موقع پر یہ نہیں کرتے

کہ انھیں خواب کی تعبیر بتا کر رخصت کر دیں، یا ان کے جذبۂ عقیدت سے فائدہ اُٹھا کر ان پر شخصیت و بزرگی کا رعب جمانے کی کوشش کریں اور اس سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہیں، بلکہ وہ ان کے اس التفات کو غنیمت سمجھ کر وہ دعوت ان کے سامنے پیش کر دیتے ہیں جو ان کے دل سے لگی ہوتی ہے ؎

آمیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اور پیش کرنے کا انداز ایسا اختیار فرماتے ہیں کہ گویا سلسلۂ سخن میں بات میں بات پیدا ہو گئی ہے، نہ کہ قصد کر کے ایک بات کے کہنے کے لیے موقع پیدا کیا گیا ہے۔ اس سے ایک اہم حقیقت تو یہ سامنے آتی ہے کہ جس طرح ایک کسان تخم ریزی کے لیے گھات لگائے بارش کا انتظار کرتا ہے اسی طرح ایک داعیٔ حق کو بھی اپنے گرد و پیش پر نظر رکھنی چاہیے کہ کب کسی کے دل کے اندر اس کے لیے وہ التفات پیدا ہوتا ہے جو اس کی دعوت کی تخم ریزی کے لیے فصل و موسم کا کام دے سکتا ہے، اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جب اللہ تعالےٰ کی مہربانی سے کوئی اس طرح کا موقع میسّر آجائے تو نہ تو اس کو ضائع کرنا جائز ہے اور نہ اس اعلیٰ مقصد کے سوا کسی اور غرض کے لیے اس کو استعمال کرنا جائز ہے، اس طرح کے مواقع جب خود غرض لوگوں کو ملتے ہیں تو وہ بجائے اس کے کہ ان کو دعوتِ حق کے لیے استعمال کریں، اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کو اپنے ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنائیں،

اس زمانہ میں عام طور پر ہمارے علماء و مشائخ اسی بیماری میں مبتلا ہیں۔ وہ جب اپنی طرف کسی دل کو ملتفت پاتے ہیں تو اس کو دیکھ کر خوش تو بہت ہوتے ہیں، لیکن ان کی خوشی اس طرح کی نہیں ہوتی جس طرح کی خوشی حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ساتھیوں کے التفات سے ہوئی تھی۔ بلکہ یہ خوشی اس مکڑی کی خوشی کی طرح ہوتی ہے جو اپنے ارد گرد

جالا تن کر مکھیوں کے انتظار میں بیٹھتی ہے، اور جب کسی مکھی کو پاس آتے دیکھتی ہے تو جوشِ نشاط سے ناچنے لگتی ہے کہ ایک فربہ شکار ہاتھ آیا۔

نواں اصول : ہر داعیٔ حق کے لیے بحث و استدلال میں مخاطب کے درجہ اور حیثیت کا لحاظ بھی ضروری ہے، مثلاً اہلِ علم سے جو خطاب ہوگا اور جس انداز اور لب و لہجہ میں ہوگا وہ اس انداز اور لب و لہجہ سے بالکل مختلف ہوگا جو عوام کے لیے اختیار کیا جائے گا۔ ایک داعیٔ حق کے لیے محض اس بنیاد پر کہ پوری سچائی صرف اسی کے ساتھ ہے، یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ دوسری تمام جماعتوں کو جن کے پاس پوری سچائی نہیں، ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا شروع کر دے۔ بلکہ اس کو چاہیے کہ ان کو ٹھیک ٹھیک تول کر ان کے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے ان کی جگہوں پر رکھے اور ہر ایک کی حیثیت کا لحاظ کر کے اس کے سامنے دعوت کو پیش کرے۔ مثلاً اہلِ کتاب کے سامنے دعوت پیش کرنے کے متعلق قرآن مجید نے یہ ہدایت فرمائی ہے :

وَلَا تُجَادِلُوٓا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَأُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلٰهُنَا وَإِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ٥ (۴۶، عنکبوت)	اور اہلِ کتاب سے نہ بحث کرو، مگر ایسے طریقہ سے جو بہتر ہے، مگر وہ جو ان میں سے ظالم ہیں اور کہو "ہم ایمان لائے اس چیز پر جو ہماری طرف اُتاری گئی ہے اور اس چیز پر جو تمہاری طرف اُتاری گئی ہے، اور ہمارا معبود اور تمہارا معبود ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔

یہاں جس احسن طریقہ سے اہلِ کتاب سے مباحثہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس کی صورت بھی بیان کر دی ہے کہ وہ جن پہلوؤں سے تمہارے ہم رتبہ ہیں یا جو اُمور ان کے اور تمہارے درمیان مشترک ہیں، ان کا اقرار کرو، تاکہ ان کے اور تمہارے

درمیان نفرت کے بجائے موانست، اور دوری کی بجائے قرب پیدا ہوا اور اس کے بعد ان سے مطالبہ کرو کہ ان مسلمات سے جو باتیں لازم آتی ہیں، ان میں بھی وہ تمہارے ساتھ متفق ہو جائیں۔

اس طریقِ دعوت کا نفسیاتی اثر مخاطب پر یہ ہوگا کہ وہ یہ دیکھ کر کہ داعی نہ اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ رہا ہے اور نہ اپنی دعوت کو کسی نئے اکتشاف کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے، بلکہ اس دعوت میں جتنا حصہ مخاطب کا ہے اس کا صاف لفظوں میں اقرار کر رہا ہے۔ وہ اس پر غور کرنے کی طرف مائل ہوگا، اور اگر وہ کھلا ہوا معاند اور ہٹ دھرم نہ ہوگا تو اس کو قبول بھی کرے گا، اور اگر ایسا نہ کیا بلکہ اہلِ علم اور اہلِ کتاب کو بھی اسی طرح خطاب کیا جائے جس طرح امیوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے تو قدرتی طور پر ان لوگوں کا پندار مجروح ہوگا، جو داعی ہی کی طرح علم اور کتاب کے مدعی ہیں اور یہ چیز قبولِ دعوت کی راہ میں شدید مزاحمت پیدا کرے گی۔

دسواں اصول: داعیٔ حق اگر مخاطب کے اندر عناد اور ہٹ دھرمی کی بو محسوس کرے تو اپنی طرف سے ہرگز اس بات کا موقع نہ دے کہ اس کا یہ مرض مزید اُبھرے، بلکہ اس سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔ یہاں تک کہ اگر وہ داعی کی کسی دلیل پر ایسا معارضہ کر بیٹھے جو بالکل کھلی ہوئی دھاندلی ہو، جب بھی اس دلیل کے پیچھے پڑنے اور اس پر ردوکد کے بجائے اس کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیئے کہ اس کے سامنے امرِ حق کسی ایسے پہلو سے پیش کیا جائے جس پر اس کو اپنی ہٹ دھرمی کے اظہار کا موقع نہ ملے۔ بلکہ اگر اس میں قبولِ حق کی صلاحیت ہو تو اس کو قبول کرے، اور اگر نرا معاند ہی ہو تو کم از کم ہکا بکا ہو کے رہ جائے۔ اس کو بحث و جدال کی راہ نہ مل سکے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ قرآن مجید میں مذکور ہے جو اس کی بہترین مثال ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ	کیا تو نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم

فِی رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۚ

(۲۵۸، بقرہ)

سے اس کے رب کے بارے میں اس وجہ سے جھگڑا کیا کہ اللہ نے اس کو اقتدار بخشا جب کہ ابراہیمؑ نے اس سے کہا "میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے" اس نے کہا "میں مارتا ہوں اور زندہ کرتا ہوں"۔ ابراہیمؑ نے کہا اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اس کو پچھم سے نکال تو کافر ہکا بکا ہو کے رہ گیا اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو دلیل پیش کی تھی وہ معترض کے معارضہ سے ذرا بھی مجروح نہیں ہوئی تھی اور وہ چاہتے، تو اس پر بہت کچھ فرما سکتے تھے، لیکن مخاطب کی نفسیات کا اندازہ کر لینے کے بعد اگر وہ اس پر مزید اصرار فرماتے تو یہ چیز اس طریقہ کے بالکل خلاف ہوتی جس کی تلقین قرآن نے فرمائی ہے کہ اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (اور بلاؤ اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے، اور ان سے اس طریقہ سے بحث کرو جو اچھا ہے)۔

انبیائے کرامؑ کا طریقِ تربیت

کوئی دعوتِ حق دنیا میں مثمر اور نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک اس کے ساتھ ایک تدریجی اور مستقل پروگرام تربیت کا نہ ہو۔ اس چیز کے لیے یوں تو ہر دعوت و تحریک کی فطرت تقاضا کرتی ہے۔ لیکن خصوصیت کے ساتھ ایک دعوتِ حق کا تو یہ ایسا لازمی جزو ہے کہ اس کے بغیر دعوتِ حق کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ جیسا کہ پچھلی فصلوں میں معلوم ہو چکا ہے۔ زندگی کے کسی ایک ہی گوشہ کو متاثر نہیں کرتی بلکہ اس کے تمام ظاہر و باطن کو ایک نیا جلوہ دیتی ہے، اور صرف کسی جزوی تبدیلی ہی کا مطالبہ لے کر نہیں اٹھتی، بلکہ ہماری ساری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے ایک بالکل نیا سانچہ اور نئی اسکیم پیش کرتی ہے۔ اس وجہ سے یہ اس کے عین مزاج ہی کا تقاضا ہے کہ یہ جس تدریج و ترتیب کے ساتھ خود آگے بڑھتی ہے اسی ترتیب و تدریج کے ساتھ، اس کے بالکل متوازی ایک تربیت کا بھی پروگرام ہوتا ہے جو اہمیت میں کسی طرح بھی اصل دعوت سے کم نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ تربیت کی اہمیت اصل دعوت سے کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے تو شاید یہ مبالغہ نہ ہو۔ کیونکہ یہ تربیت ہی ہے۔ جس کی وجہ سے کوئی دعوت دلوں میں جڑ پکڑتی ہے، پھر نشو و نما پاتی ہے، پھر برگ و بار لاتی ہے یہاں تک کہ ایک دن اپنے فوائد و برکات سے معاشرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔

ایک داعیِ حق کے کام کی صحیح مثال ایک دہقان کے کام سے دی جا سکتی ہے۔

جس طرح اس کا مقصد صرف اتنی سی بات سے حاصل نہیں ہوسکتا کہ کچھ بیج کسی زمین میں ڈال کر فارغ ہو بیٹھے۔ اسی طرح ایک داعی حق کا کام بھی صرف اتنے سے انجام نہیں پاسکتا کہ وہ لوگوں کو کچھ وعظ سُنا کر سو رہے۔ بلکہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر اپنی پھیلائی ہوئی دعوت کے ساتھ وہی لگاؤ ہو جو ایک فرض شناس کسان کو اپنے بوئے ہوئے بیج کے ساتھ ہوتا ہے۔

جس طرح کسان نگرانی کرتا ہے کہ بیج زمین میں جڑ پکڑے، اس کو صحیح وقت پر پانی ملے، موسم کی ناسازگاریوں سے محفوظ رہے، صحیح طور پر نشو ونما پائے، بے گانہ سبزے اس کی ترقی میں مزاحم نہ ہوں۔ فضا کے پرندوں اور زمین کے چرندوں کی تاخت سے وہ سلامت رہے اور جب ایک مدت تک اس دھن میں اپنے دن کے اطمینان اور رات کے سکون کو وہ درہم برہم رکھتا ہے، لگاتار محنت اور مسلسل نگہداشت کرتا ہے تب جاکر کہیں اپنی محنت کا پھل پاتا ہے۔ اسی طرح ایک داعی حق کو بھی اسی صورت میں اپنی دعوت کو پھولتے پھلتے دیکھنا نصیب ہوتا ہے جب وہ دعوت کے ساتھ ساتھ تربیت کی جانکاہیوں کے ایک طویل سلسلہ کو جھیلنے کی قابلیت اور ہمت رکھتا ہو۔ ورنہ جس طرح ایک غافل کسان کے بوئے ہوئے بیج زمین اور موسم کی بے مہریوں اور چرند و پرند کی ترکتازیوں کی نذر ہوجاتے ہیں، اسی طرح ایک داعی کی دعوت بھی صدا بصحرا ہو کے رہ جاتی ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کے طریق دعوت و تربیت پر غور کرنے سے جماعتی تربیت کے لیے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے بعض اہم چیزوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

جماعتی تربیت کی پہلی اصل

جماعتی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ داعی کو تعلیم و دعوت کے کام میں جلد بازی سے احتراز کرنا چاہیئے۔ اس کو یہ برابر دیکھتے رہنا چاہیئے کہ تعلیم کی جو

خوراک اس نے دی ہے وہ اچھی طرح ہضم ہوکر لوگوں کے فکر وعمل کا جزو بن گئی ہے یا نہیں ؟ اس کا پورا پورا اندازہ کیے بغیر اگر مزید غذا دے دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فسادِ معدہ اور سوءِ ہضم کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

جن لوگوں نے داعیانِ حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر داعیٔ حق سے معاملۂ دعوت میں جلد بازی کے لیے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے۔ جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہیں وہ حق کی لذّت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں، یہ نئی نئی آشنائی اُن میں حق کا ایسا شوق پیدا کر دیتی ہے کہ تدریج و تربیت کا پروگرام ان پر بہت شاق گزرتا ہے، وہ حق کی حرص میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوتِ ہضم کا صحیح صحیح اندازہ کر پاتے نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کا لحاظ کرنے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصلی حیثیت سے تولتے ہیں، اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی ان کی استعداد سے زیادہ قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر ہل من مزید کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ جو ابھی دعوت کے مخالف ہوتے ہیں وہ دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

وہ اگر اس کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں پاتے تو یہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز ان کے مطالبہ کے جواب میں فوراً نہ پیش کی گئی تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں گے کہ یہ محض ایک بے مقصد اور مجہول دعوت ہے۔ اس کے آگے نہ کوئی متعیّن منزل مقصود ہے، نہ اس منزل تک پہونچنے کا کوئی واضح اور ٹھوس پروگرام ہے۔ اور اگر کوئی چیز پیش کی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈھ کر لوگوں کو دکھا سکیں گے۔ اور کوئی رخنہ تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا تو اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

علاوہ ازیں ایک سچے داعیٔ حق کے اندر تبلیغ حق کی ایک پُرزور خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے، جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبر و انتظار اور تدریج و ترتیب کے سارے حدود و قیود وہ توڑ ڈالے۔ اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبہ جب مشتعل کر دیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لیے ضروری ہے۔ ہر چند حق کی سچی محبت کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لیے آدمی میں ندیدوں کی سی بھوک ہو، جو اسے مضطرب بھی رکھے، بے صبر بھی بنا دے اور جلد بازی پر بھی مجبور کر دے لیکن جماعت کی تربیت کا مطالبہ، حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبہ سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے ایک داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح صحیح توازن قائم رکھے۔

اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لیے بے چین کرے تو چاہئے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظارِ حق پر مجبور کرے۔ اگر اعلانِ حق کا شوق اور حمایتِ حق کا جذبہ اس کو اُکسائے کہ نہ وہ اہلِ شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے نہ معاندین پر اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے تو چاہئے کہ تربیت کے اہتمام کے لیے وہ اس امر پر بھی نظر رکھے کہ کہیں شراب، قدح خوار کے ظرف سے زیادہ نہ ہو جائے۔

جب کبھی ایسا ہوا ہے کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آگیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہو سکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے، اسی رخنہ سے شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دیئے ہیں اور پھر اس کے پھیلائے ہوئے فتنوں کی لپیٹ میں پوری جماعت آگئی۔

اس کی سب سے زیادہ عبرت انگیز مثال ہم کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکل کر سینا میں پہنچے تو اللہ تعالٰے نے

ان کو احکامِ شریعت سے آگاہ کرنے کے لیے طور پر بلایا اور اس غرض کے لیے ایک خاص دن معیّن فرما دیا۔

حضرت موسیٰؑ اس معیّن دن سے پہلے ہی طُور پر پہنچ گئے۔ ان کے اندر اللہ کے احکام معلوم کرنے اور اس کی رضا طلبی کا جو جوش و جذبہ تھا اولاً تو وہ خود ہی اتنا قوی تھا کہ باریابی کا اشارہ پانے کے بعد وقت اور تاریخ کی پابندیاں اس پر شاق تھیں،

ثانیاً قوم کی طرف سے ہر قدم پر جو مطالبے ہو رہے تھے اس سے بھی اس جذبہ کو تحریک ہوئی ہو گی۔ اگرچہ یہ جذبہ نہایت اعلیٰ اور محمود جذبہ تھا، اور طُور پر معیّن وقت سے پہلے پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اللہ کے احکام معلوم کرنے کے لیے نہایت بے چین اور مضطرب دل رکھتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ کا ایک دوسرا قابلِ اعتراض پہلو بھی تھا، جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر نہیں گئی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فوراً بُلانے کی بجائے ان کے لیے جو ایک خاص وقت مقرر کیا تو اس سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ یہ وقفہ وہ قوم کی تربیت میں صرف کریں، اور جن اصولی باتوں کی قوم کو تعلیم دی جا چکی ہے اس کو اچھی طرح ان کے اندر پختہ کریں، تاکہ آزمائشوں اور فتنوں میں پڑنے کے بعد بھی وہ اپنے ایمان و اسلام کو سلامت رکھ سکے۔

لیکن اللہ تعالےٰ کے مزید احکام معلوم کرنے کا شوق ان پر اس قدر غالب آگیا کہ تربیت کی اہمیّت کا احساس اس کے مقابل میں دب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے دشمنوں نے ان کی اس غیر حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصّہ کو گئو سالہ پرستی میں مبتلا کر دیا، اور اس کی ساری ذمّہ اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کی عجلت پسندی پر ڈالی، جو ہر چند تعلیم و دعوت ہی کی راہ میں تھی، لیکن بہرحال تربیت کی ذمّہ داریوں سے غافل کرنے والی ثابت ہوئی، چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اور اس کے انجام کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ○	اور تم قوم کو چھوڑ کر اے موسیٰؑ وقت مقررہ
قَالَ هُمۡ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَ	سے پہلے کیوں چلے آئے ؟ انہوں نے
عَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ○ قَالَ	کہا وہ میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس
فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ	اے پروردگار! اس لیے جلدی چلا آیا
وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ○	کہ تیری خوشنودی حاصل کروں فرمایا تو جاؤ
(۸۳، ۸۵ طٰہٰ)	ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے چلے آنے کے بعد

فتنہ میں ڈال دیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا "۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ایک داعی کا یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام و قوانین سے آگاہ کرے، اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت کرے، تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکر و عمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے۔

جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبر و انتظار مطلوب ہے، اس کا حق ادا نہیں کر سکتا، اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھا چلا جا رہا ہے، اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا، دوسری طرف اس کے مقبوضہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔

سورۂ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکامِ الٰہی معلوم کرنے کے لیے تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے فطری شوقِ علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحیِ الٰہی جلد جلد نازل ہو، تاکہ آپ

اپنے شوقِ علم کو بھی تسلّی دے سکیں اور قوم کے مطالبہ کو بھی پورا کر سکیں۔ چنانچہ اسی شوق کی وجہ سے جب وحیِ الٰہی اُترتی، آپؐ ایک پُرشوق طالب علم کی طرح اس کے سیکھنے میں جلد بازی فرماتے۔

اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں اس بات پر متعدد جگہ آپؐ کو ٹوکا کہ وحیِ الٰہی کی تکمیل کے لیے جو مدّت مقرر ہے اس سے پہلے پورے قرآن کے اُتار دیئے جانے کے لیے جلدی نہ مچاؤ، یہ وقفہ اور انتظار تمہارے دل کو مضبوط کرنے اور تمہاری قوم کی تربیت کے لیے ہے، تاکہ جو کچھ تمہیں سکھایا جارہا ہے اس کو تم بھی برداشت کر سکو اور تمہاری قوم بھی اس میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ٥ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ٥

(طٰہٰ ۱۱۵، ۱۱۴)

اور قرآن کے لیے اس سے پہلے کہ اس کی وحی تم پر تمام کی جائے جلدی نہ مچاؤ، (البتہ) یہ دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار میرے علم کو زیادہ کر، اس سے پہلے ہم نے آدمؑ پر ایک ذمّہ داری ڈالی تھی تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔

اس آیت کے آخر میں جلد بازی سے بچنے اور تربیت کی اہمیّت بھی واضح فرمادی ہے کہ انسان میں یہ فطری کمزوری ہے کہ رغبات اور خواہشوں کے مقابلہ میں اس کا ارادہ کمزور پڑ جایا کرتا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس پر جو ذمّہ داری ڈالی جائے اس کا پورا شعور پیدا کرنے کے لیے اس کی اچھی طرح تربیت بھی کی جائے تاکہ وہ آزمائشوں کے وقت اپنے آپ کو ثابت قدم رکھ سکے۔

اسی تربیت کے تقاضے سے قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے اُترتا تو جلد باز مخالفین اعتراض کرتے کہ اگر یہ اللہ کی کتاب ہے تو جستہ جستہ کیوں اُتر رہی ہے؟۔ خدا کا علم تو حاضر و

مستقبل سب کو گھیرے ہوئے ہے، اس کو تو نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ تجربہ کرنے کی، اور نہ کسی مصلحت پر نظر رکھنے کی، پھر آخر وہ پوری کتاب ایک ہی دفعہ کیوں نہیں اُتار دیتا ہے۔ یہ تو صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اپنی تصنیف ہے۔ غور و فکر اور محنت و تجربہ کے بعد جتنی کچھ تیار کر پاتے ہیں اس کو پیش کرتے ہیں۔ قدرتی طور پر اس اعتراض کا اثر بہت سے مسلمانوں پر بھی ہوا اور یہ بات خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک پر بھی گراں گزری، لیکن اللہ تعالےٰ نے نہ تو مخالفین کی جلدبازی ہی کی حوصلہ افزائی فرمائی اور نہ اس خلش ہی کو کچھ اہمیت دی، جو نکتہ چینوں کے اس اعتراض اور فطری شوقِ علم کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کے دل میں پیدا ہوتی تھی۔

بلکہ فرمایا کہ تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی تربیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہمارے احکام تھوڑے تھوڑے کر کے ایک تدریج کے ساتھ اُتریں تاکہ تمہارا دل بھی ان کے تحمّل کے لیے پوری طرح مضبوط ہو جائے اور جماعت کے قوی اور ضعیف بھی ان کو اچھّی طرح اپنا لیں۔ اگر جلد بازی کرو گے تو تمہاری امّت میں کمزوری رہ جائے گی اور جس طرح سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہی میں ڈال دیا۔ اسی طرح کوئی سامری تمہاری امّت میں بھی پیدا ہو کر اس کو گمراہی میں مبتلا کر دے گا۔

جو تدریج قرآن کے نزول میں ہم پاتے ہیں بعینہٖ وہی تدریج صحابہ اور بعد کے لوگوں نے اس کو سیکھنے اور سکھانے میں بھی ملحوظ رکھی۔ اس کی مصلحت بھی بعینہٖ وہی تھی کہ جو لوگ اس کو سیکھیں، اس طرح سیکھیں کہ یہ ان کے ذہن و دماغ کے اندر بھی پیوست ہو جائے اور ان کی عملی زندگی بھی بالکل اس کے رنگ میں رنگ جائے، یہ بات صرف اسی صورت میں ممکن تھی کہ اس کی تعلیم ایک تدریج کے ساتھ آہستہ آہستہ لوگوں کو دی جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس علم کے

مطابق ان کی تربیت بھی کی جائے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ:۔

قَالَ کَانَ الرَّجُلُ مِنَّا اِذَا تَعَلَّمَ عَشَرَ اٰیَاتٍ لَمْ یُجَاوِزْھُنَّ حَتّٰی یَعْلَمَ مَعَانِیَھُنَّ وَالْعَمَلَ بِھِنَّ (ہم میں جو شخص دس آیتیں بھی سیکھ لیتا تو جب تک ان کے علم و عمل میں اچھی طرح پختہ نہ ہو جاتا آگے نہ بڑھتا)۔

دوسری اصل : جماعتی تربیت کی دوسری اصل یہ ہے کہ داعی کمیّت سے زیادہ کیفیت پر نظر رکھے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی پر "کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش" کا شوق اس قدر غالب ہو جایا کرتا ہے کہ وہ "گلّہ کی بھیڑوں" سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس غفلت کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ تو کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں میدانوں اور جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوتا ہے، اور ادھر گلّہ کی بھیڑیں یا تو بھوکوں مرنے لگ جاتی ہیں یا کوئی بھیڑیا باڑے کے اندر گھس کر ان کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے۔ اپنوں سے یہ بے پروائی اور بیگانوں کو اپنانے کی یہ خواہش داعیانِ حق کے اندر نہایت نیک جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ان پر دعوت کا جوش اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے فرض کا احساس اس کے مقابل میں یا تو دب جاتا ہے یا کم از کم پیچھے پڑ جاتا ہے وہ اس بات کو زیادہ اہمیّت دینے لگ جاتے ہیں کہ جو اللہ کے باغی اور نافرمان ہیں وہ پہلے اللہ کا نام لینے والے بن جائیں۔ رہی ان کی تربیت و اصلاح تو یہ چیز بعد میں ہوتی رہے گی۔

بظاہر تو یہ ایک نیک خیال ہے، لیکن اگر اس کی تہہ میں غور کیا جائے تو یہی اصل ہے کیفیت کے مقابل میں کمیّت کو ترجیح دینے کی، اور پھر آگے چل کر اسی سے یہ غلط نقطۂ نظر پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگ دلوں کی جگہ سروں کی تعداد گن کر پوری طرح مطمئن ہو جاتے ہیں، قرآن مجید نے اس غلطی سے بچانے کے لیے داعیانِ حق کو یہ تعلیم

دی ہے کہ جو لوگ دعوت سے بیگانہ ہیں ان کو پکارنے اور اپنانے کی خواہش اتنی غالب نہ ہونی چاہئے کہ اس انہماک میں ان غریبوں کا حق مارا جائے جو بے چارے دعوت قبول کر کے تربیت و تزکیہ کے لیے منتظر بھی ہیں اور اس کے محتاج بھی ہیں :۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۔

(۸۸ ، الحجر)

اور ان کی (کفار کی) بعض جماعتوں کو ہم نے جو مال و متاع کی فراوانی دے رکھی ہے اس کی طرف نظر نہ اٹھاؤ اور نہ ان کے انکار پر غم کھاؤ، بلکہ مومنین کو اپنے سایۂ عاطفت میں لو۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ

(۲۸ - الکہف)

اور تم اپنے دل کو ان لوگوں کے ساتھ جماؤ جو صبح و شام اپنے رب کی رضا طلبی میں سرگرم دعا ہیں اُن سے غافل ہو کر تمہاری نگاہیں دنیاوی زندگی کی زینتوں کی طرف نہ اٹھیں۔

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ ۝ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ ۝ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ ۝ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ ۝ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ ۝ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ ۝

(عبس)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیرا اس سبب سے کہ اُس کے پاس نابینا آیا اور تمہیں کیا خبر کہ شاید وہ پاکی حاصل کرے، یا نصیحت پکڑے اور نصیحت اس کو فائدہ پہنچائے، یا جو منہ جو پھیرتا ہے تو تم اس کے پیچھے پڑتے ہو۔

ان تمام آیتوں میں داعی کو اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ جو لوگ دعوت

قبول کر چکے ہیں ۔ اگرچہ وہ بظاہر تعداد کے لحاظ سے کم اور حیثیت کے لحاظ سے معمولی ہوں، لیکن ان کی تربیت میں جو وقت صرف ہونا چاہیئے، وہ ان لوگوں کے پیچھے نہ برباد کیا جائے جو اگرچہ شان و عظمت رکھتے ہیں اور ان کی اس شان و عظمت سے دعوت کو فائدہ پہونچنے کی توقع بھی ہو سکتی ہے ۔ لیکن وہ گھمنڈ کے نشہ میں سرشار اور دعوت سے بے زار ہیں ۔

تیسری اصل : جماعتی تربیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جماعت جن اصولوں پر بنی ہے جماعت کے کسی گوشہ میں ان سے انحراف یا بغاوت کی بیماری نہ پھیلنے دی جائے اگر اس قسم کا کوئی فتنہ سر اُٹھاتا نظر آئے تو جماعت کے رہنماؤں اور ارباب کار کا فرض ہے کہ اس کے پھیلنے سے پہلے اس کے قلع قمع کی فکر کریں، اور اس فرض کی ادائیگی میں نہ مصلحت بینی مانع ہو نہ رواداری، نہ کسی کا خوف اور نہ کسی کی محبت ۔ اس امر میں معمولی غفلت کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں ظاہر ہوا کہ قوم کا ایک بڑا حصہ خدا پرستی کی جگہ گو سالہ پرستی میں مبتلا ہو گیا ۔

اس قسم کے فتنوں کی سرکوبی کے لیے جماعت کے لیڈروں کو نہ صرف قوی دل ہونا چاہیئے بلکہ کچھ مضائقہ نہیں اگر وہ سخت دل بھی ہوں، تاکہ بالکل بیمروّت ہو کر ان کو جڑ پیڑ سے اُکھاڑ پھینکیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی قوم کے اندر جب شرک کے فتنہ کے پھوٹ پڑنے کی اطلاع ہوئی تو طور سے واپس آکر انھوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کو نہایت سختی سے ڈانٹا جو ان کی غیر موجودگی میں قوم کی نگرانی کے ذمہ دار تھے، اور جن کی مروّت یا رواداری کی وجہ سے اس خرابی کو پھیلنے کا موقع ملا ۔ پھر انھوں نے اصلی مجرموں کو خود ان کے قبیلہ کے لوگوں کے ہاتھوں قتل کرا دیا تاکہ ہر شخص پر یہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ جو لوگ جماعت کے اندر اس قسم کے فتنے پھیلائیں

گے وہ ان لوگوں کی طرف سے بھی کسی رحم یا رواداری کی امید نہیں کر سکتے جن کے ساتھ وہ خون اور نسب کے قریبی رشتے رکھتے ہوں گے۔

اس کے علاوہ اس بت کو بھی ریزہ ریزہ کر کے ناپید کر دیا جو سامری نے بنایا تھا، تاکہ اس فتنہ کا کوئی ادنیٰ نشان بھی قوم میں باقی نہ رہے۔ اور خود سامری کو تو ایسی عبرت انگیز سزا دی جو اس کے ساتھ زندگی بھر کے لیے چمٹ گئی۔

جماعت کو اس قسم کی خرابیوں سے پاک رکھنے کے لیے اسلام نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ جب جماعت کے بعض افراد میں جماعتی اصولوں سے کوئی انحراف پایا جائے تو پوری جماعت کا فرض ہے کہ اس کی روک تھام اور اصلاح کے لیے کوشش کرے۔ اگر جماعت ایسا نہ کرے بلکہ افراد کو چھوڑ دے کہ جو ان کے جی میں آئے کرتے رہیں تو ان کے جرم کا وبال صرف ان ہی تک محدود نہیں رہتا۔ بلکہ جماعت کے فاسق اور متقی سب اس میں حصہ پاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کی حقیقت کشتی کی مثال دے کر سمجھائی ہے، کہ اگر ایک کشتی کے مسافر اس شخص کا ہاتھ نہ پکڑیں جو کشتی کے پیندے میں سوراخ کر رہا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کشتی ڈوبے گی اور ایک شخص کی شرارت کی سزا سب کو بھگتنی پڑے گی، اسی طرح اگر ایک جماعت اپنے اندر کے شریروں سے رواداری برتتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ یہ شریر جو آفت ڈھائیں اس میں بلا استثناء پوری جماعت مبتلا ہو۔

قرآن مجید نے اس خطرہ سے ان الفاظ میں آگاہ فرمایا ہے :-

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ	اور اس آفت سے بچو جو خاص کر ان ہی
الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً ۖ	لوگوں پر نہیں آئے گی جنہوں نے تمہارے
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝	اندر سے ظلم کیا ہوگا (بلکہ دوسرے بھی

اس کی لپیٹ میں آئیں گے یاد رکھو (۲۵ ۔ الانفال)
کہ اللہ تعالیٰ سخت پاداش والا ہے ۔

اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جماعت کے مختلف مدارج کے لحاظ سے طریقِ کار مختلف ہوگا۔ لیکن نفس فرض سے جماعت کسی حال میں بھی بری الذّمہ نہیں ہوتی ۔

ابتدائی مرحلہ میں، جب جماعت کو کوئی سیاسی طاقت حاصل نہیں ہوتی، صرف جماعت کا مزاج ان لوگوں کو اپنے اندر سے چھانٹ کر الگ کرتا رہتا ہے جو اس کے اصولوں سے انحراف کرتے ہیں وہ اولاً تو ان لوگوں کو اپنے اندر جگہ ہی نہیں دیتی جو اس کے رنگ میں اچھی طرح رنگے ہوئے نہ ہوں اور اگر اس قسم کے خام لوگ اس کے اندر کسی طرح گھس بھی آتے ہیں تو جس طرح ایک سلیم المزاج آدمی کے معدہ کے اندر مکھّی قرار نہیں پکڑتی، اسی طرح اس قسم کے لوگ اس نظام کے اندر نہیں ٹِکتے ۔ اگر اس پہلے ہی مرحلہ میں کسی جماعت کا یہ حال ہو کہ اس کے اصولوں سے انحراف کرنے والے اس کے اندر آسانی سے پرورش پا سکتے ہوں تو اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اس جماعت کا کوئی مزاج ہی نہیں بنا ہے اور وہ بہت جلد منتشر ہو کے رہے گی ۔

دوسرے مرحلے میں یعنی جب جماعت کو سیاسی طاقت حاصل ہو جاتی ہے، جماعت کا سیاسی ادارہ اس بات کی نگرانی کرتا ہے کہ اس کے اندر فاسد عناصر پیدا ہونے یا گھسنے نہ پائیں، اور وہ اس کی روک تھام کے لیے تبلیغی و تعلیمی وسائل کے ساتھ اگر ضرورت سمجھتا ہے تو طاقت کو بھی استعمال کرتا ہے ۔ یہ سیاسی ادارہ اگر پوری فرض شناسی کے ساتھ اپنی ذمّہ داریوں کو ادا کرتا رہے تو پوری جماعت ذمّہ داری سے بَری رہتی ہے ۔

لیکن اگر خدانخواستہ یہ بگڑ جائے تو پوری جماعت کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عَلَم لے کر اُٹھے اور جب تک

اس کی اصلاح نہ کرلے چین کی نیند نہ سوئے۔ اس دعوتِ اصلاح کی حد قرآن مجید نے یہ معیّن کی ہے کہ داعیانِ اصلاح صرف صدائے اصلاح پر قانع نہ ہوجائیں بلکہ مجرمین کے طرزِ عمل سے اظہارِ بے زاری کرکے ان کے جرائم سے اپنے آپ کو عملاً علیحدہ بھی کرلیں۔

چوتھی اصل : جماعتی تربیت کا چوتھا اصول یہ ہے کہ ابتدائے دعوت میں جہاں تک ممکن ہو لوگوں کو تعلیم و دعوت کے اصل مرکز سے وابستہ رہنے کی تاکید بھی کی جائے اور اس کا سامان بھی بہم پہنچایا جائے۔ جس دَور میں جماعت کا مزاج ابھی بن رہا ہو اس دَور میں مناسب ماحول اور اصل مرکز سے براہِ راست وابستگی صحیح تربیت کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیزیں ہیں۔ اس دَور میں اگر ان دونوں چیزوں سے غفلت کی جائے تو جماعت کے اندر ایسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں جو عقلی اور اخلاقی دونوں پہلوؤں سے اتنے مضبوط ہوں کہ اپنے آپ کو بھی دعوت کے اصلی رنگ میں رنگ لیں اور دوسروں کو بھی اس رنگ میں رنگ سکیں۔

بلکہ اس کے برعکس بیشتر ایسے لوگ پیدا ہوجاتے ہیں جن پر دعوت کا رنگ اتنا ہلکا ہوتا ہے کہ آزمائش کی ایک ہی بھٹی سے گزرنے کے بعد اُڑ جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ نہ فہم کے اعتبار سے اتنے پختہ ہوتے کہ دوسروں کے اندر دعوت کا صحیح شعور پیدا کرسکیں۔ نہ سیرت کے لحاظ سے اتنے مضبوط ہوتے کہ ہر طرح کے موافق و ناموافق حالات کے اندر اس دعوت کو جاری رکھ سکیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب تک کوئی موثر شخصیت موجود ہوتی ہے، لوگوں کے اندر اس دعوت کا چرچا موجود رہتا ہے۔ لیکن جونہی وہ سامنے سے ہٹی سارا ہنگامہ سرد پڑ گیا۔ اسلام میں ہجرت کا جو حکم دیا گیا، اس کے اندر جہاں اور بہت سی حکمتیں ہیں، ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی تھی کہ تمام مسلمان براہِ راست حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے فیضِ صحبت سے فائدہ اُٹھا سکیں، اور ایک سازگار ماحول میں رہ کر اسلام کا رنگ ان پر اچھی طرح چھا جائے۔ جہاں یہ بات ممکن نہ ہو کہ ہر شخص اصل مرکزِ تعلیم و دعوت سے براہِ راست فائدہ اُٹھا سکے وہاں دعوتِ اسلامی کا کم سے کم مطالبہ یہ ہے کہ ہر گروہ کے ذہین اور صالح اشخاص کی ٹولیاں مرکز کی تعلیم و دعوت سے استفادہ کے لیے نکلیں، اور دین کا فہم حاصل کرنے کے بعد جب اپنی قوم میں لوٹیں تو اُن کو دین کے علم سے باخبر کریں:۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔ (۱۲۲، توبہ)	اور سارے مسلمانوں کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ تعلیم کے لیے نکلتے تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک ٹولی نکلتی، تاکہ وہ دین کی بصیرت حاصل کرتی اور جب لوٹتی تو وہ اپنی قوم کو آگاہ کرتی، تاکہ وہ بھی خدا ترسی کی راہ اختیار کرتے۔

پانچویں اصل:۔ جماعتی تربیت کا پانچواں اصول یہ ہے کہ جماعت کے سامنے آزمائش کے جو مواقع آئیں ان میں جماعت کی غلطیوں اور خامیوں پر پوری نظر رکھی جائے۔ اور جب وہ آزمائش کا وقت گزر جائے اور اطمینان کا سانس لینے کا موقعہ میسّر آجائے تو ان میں سے ہر غلطی اور خامی پر بے رو رعایت تنقید کی جائے۔ اور یہ عقلی کمزوریاں جن اعتقادی خامیوں کی غمّازی کر رہی ہوں ان کو بھی پوری وضاحت کے ساتھ کھول کر سامنے رکھ دیا جائے۔

شروع شروع میں اس تنقید کا خطاب عام ہونا چاہیے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اپنی اپنی جگہ پر ہر شخص اس تنقید سے متنبہ ہوگا، اور اگر طبیعت میں صلاحیت ہوگی تو

اس سے فائدہ بھی اٹھائے گا۔ پہلے ہی مرحلہ میں متعین طور پر صرف غلط کاروں کو نام بنام ملامت کرنے سے ان کو اپنی رسوائی کا احساس ہوتا ہے۔ جس سے ان کے اندر اصلاحِ حال کے بجائے ضد اور ہٹ دھرمی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ البتہ جب کسی گروہ کے متعلق بار بار کے تجربے کے بعد بھی یہی ثابت ہو کر وہ جماعت کے اُصولوں سے صرف کسی ذہنی الجھن کی وجہ سے یا محض اتفاقی طور انحراف نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ قصد و ارادہ کے ساتھ اس نے منافقت ہی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ تو اس کو براہِ راست اس کی غلطیوں پر متنبہ کرنا چاہیئے۔ اور پردہ داری اور رواداری کا طریقہ بدل دینا چاہیئے اس گروہ کو یہ آخری تنبیہ ہوگی۔ اس کے بعد بھی اگر یہ گروہ اپنی اصلاح نہ کرے تو پھر جماعت کا فرض ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اپنے اندر سے بالکل کاٹ پھینکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم نے منافقین کے ساتھ یہی طریقہ اختیار فرمایا اور یہی طریقہ جماعتی تربیت کے لیے عقل و فطرت کے مطابق ہے۔

جو لوگ قرآن مجید پر نظر رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اسلام کی تاریخ میں بدر کی لڑائی وہ پہلا آزمائشی موقع ہے جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ اسلامی جماعت کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے اندر کچھ جراثیم نفاق کے چھپائے ہوئے ہیں۔

جنگ کے حالات گزرنے کے بعد قرآن نے ان لوگوں کے طرزِ عمل پر نہایت سختی سے تنقید کی، جس کی شہادت **سورۂ انفال** سے مل رہی ہے۔ لیکن اس وقت نہ تو تعین کے ساتھ ان کو مخاطب کر کے انھیں رسوا کیا گیا اور نہ ان کو جماعت ہی سے الگ کیا گیا۔ اس کے بعد ہر آزمائش کے موقعہ پر یہ گروہ اپنی کمزوریاں ظاہر کرتا رہا۔

لیکن عام تنقید و نصیحت کے سوا قرآن نے ان پر براہِ راست کوئی ضرب

نہیں لگائی۔ تقریباً معرکہ تبوک تک یہی صورتِ حال قائم رہی۔

لیکن جب ان لوگوں پر اچھی طرح حجّت تمام ہو گئی اور یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ ان لوگوں کی شرارتیں کسی بے علمی یا اتّفاقی مغلوب الحالی کا نتیجہ نہیں ہیں، بلکہ یہ جو کچھ کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ٹھنڈے دل سے کر رہے ہیں تو پھر یہ لوگ جماعت کے اندر سے کاٹ کر علیحدہ کر دیئے گئے۔

داعئ حق کی ذمّہ داری

داعئ حق ہو یا داعئ ضلالت، دونوں میں سے کسی کو بھی اللہ تعالےٰ نے دعوت اور ترغیب سے کسی چیز کا اختیار نہیں بخشا ہے۔ نہ پیغمبروں کو یہ اختیار حاصل ہے کہ کسی کے دل میں ہدایت ڈال دیں، اور نہ شیطان ہی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو گمراہی کی راہ پر لگا دے، ان میں سے ہر ایک کو بس یہ اختیار حاصل ہے کہ یہ اپنی اپنی راہ کی طرف خلقِ خدا کو بُلا سکتے ہیں۔

ہدایت یا ضلالت کو اختیار کرنا، اختیار کرنے والے کی اپنی پسند اور اللہ کی خاص توفیق یا تیسیر پر منحصر ہے۔ اس توفیق اور تیسیر کے لیے اللہ تعالےٰ نے ایک ضابطہ بنا دیا ہے جس کے مطابق وہ اپنے سلیم الفطرت اور ہدایت پسند بندوں کو نبیوں کے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرماتا ہے اور کجروی اور گمراہی کو پسند کرنے والوں کے لیے شیطان کے راستوں پر چلنا آسان کر دیتا ہے۔ یہی حقیقت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان آیات میں واضح کی گئی ہے:-

إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ (قصص)	تم جس کو چاہو ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ تعالےٰ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ○ (یوسف)
اور اکثر لوگ، خواہ تم کتنا ہی چاہو ایمان نہیں لانے کے۔

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ○
اگر تم ان کی راہ یابی کے متمنّی ہو تو سُن رکھو کہ اللہ نہیں راہ یاب کرتا ہے ان لوگوں کو جن کو گمراہ کر دیتا ہے اور ایسوں کا کوئی مددگار نہیں۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ۔ (ابراہیم)
یہ کتاب ہے جو ہم نے تم پر اُتاری ہے تاکہ تم لوگوں کو تاریکیوں میں سے روشنی کی طرف لاؤ ان کے رب کی توفیق سے۔

اسی طرح ابلیس کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۔ (الحجر)
میرے بندوں پر تجھ کو کوئی قابو حاصل نہیں ہے۔ صرف ان پر تیرا زور چلے گا جو شریروں میں سے تیری پیروی کریں گے۔

خود ابلیس کی زبان سے اس کا یہ اعتراف نقل کیا ہے:۔

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ ج فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۔ (ابراہیم ۲۲)
اور مجھ کو تم پر کوئی اختیار نہیں ملا تھا، مگر یہ کہ میں نے تم کو دعوت دی، تو تم نے میری دعوت پر لبیک کہا تو اب مجھ کو ملامت نہ کرو، بلکہ اپنے آپ کو ملامت کرو۔

اس امرِ واقعی کی وجہ سے جہاں تک ایک داعیٔ حق کا تعلق ہے وہ اس مسئلہ پر بالکل غور نہیں کرتا، اور نہ اسے غور کرنا چاہیے کہ لوگ اس کی دعوت پر کان دھریں گے یا نہیں، اور نہ اس فکر میں وہ سر کھپاتا، اور نہ اس کو سر کھپانا چاہیے، کہ زمانہ اس کی دعوت

کے لیے سازگار ہے، یا ناسازگار۔ وہ لوگوں کے ردّ وقبول، اپنی کوششوں کی کامیابی و ناکامی اور دعوتِ حق کے انجام کے متعلق ایک بار یہ فیصلہ کرکے، کہ اس امر کا تعلق اس کی ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالےٰ کی ذات سے ہے، بالکل مطمئن ہوجاتا ہے۔ وہ صرف اس بات پر غور کرتا ہے کہ خود اس کا اپنا فرض کیا ہے ؟۔

اور جب یہ طے کرلیتا ہے کہ اس کا اپنا فرض یہی ہے کہ وہ اس مقصد کی دعوت دے جس کو وہ حق یقین کررہا ہے اور جو اس کے خیال میں تمام دنیا کے لیے یکساں مفید ہے، تو یہ طے کرچکنے کے بعد وہ اس تردّد میں نہیں پڑتا کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کرنے کے بارے میں اپنا فرض پورا کریں گے یا نہیں۔ اور اللہ تعالےٰ اس دعوت کو دنیا میں برپا کرے گا یا نہیں ؟۔

جہاں تک لوگوں کے ردّ وقبول کا تعلق ہے، وہ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں، دونوں صورتوں میں اس کی اپنی ذمّہ داری بدستور قائم رہتی ہے۔ اگر وہ قبول کریں گے تو ان کے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور فلاح کی راہیں کھلیں گی اور یہ اللہ تعالےٰ کے ہاں ادائے فرض و دعوت کا اجر و ثواب حاصل کرے گا، اور اگر نہ قبول کریں گے تو اس کے ذریعہ لوگوں پر خدا کی حجّت پوری ہوگی اور داعی اللہ کے ہاں اپنی ذمّہ داری سے سبکدوش قرار دیا جائے گا کہ اس کا جو فرض تھا اس نے پورا کردیا۔ قرآن میں داعیانِ حق کی ایک جماعت کا جواب نقل ہوا ہے جن کو ان لوگوں کے سامنے بے فائدہ اپنی دعوت پیش کرنے سے روکا گیا تھا۔ جو دعوت کو قبول کرنے والے نہیں تھے۔

اس جواب سے داعیٔ حق کے فرض کی نوعیّت واضح ہوتی ہے کہ لوگ اس کی دعوت کو قبول کریں یا نہ کریں دونوں صورتوں میں اس کا فرض صرف حق کی دعوت دیتے رہنا ہے، اگر لوگ قبول کریں گے تو ہدایت پائیں گے اور اگر نہ قبول کریں گے تو یہ

اللہ کے ہاں بری الذمہ قرار پائے گا :۔

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمًا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ○ (۱۶۴، الاعراف)	اور جب کہ کہا ان میں سے ایک جماعت نے کہ ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو یا تو اللہ تعالےٰ ہلاک کرنے والا ہے یا کم از کم سخت عذاب دینے والا ہے انھوں نے جواب دیا کہ اس لیے کہ اللہ تعالےٰ کے یہاں ہمارا عذر واضح ہو جائے اور تاکہ وہ خدا سے ڈریں۔

باقی رہا اللہ تعالےٰ کی مدد و نصرت کا معاملہ تو مجرد یہ بات کہ اللہ تعالےٰ نے اس پر اس حق کو واضح کیا ہے، اس کے دل کے اندر یہ اطمینان پیدا کرتی ہے کہ اس حق کی دعوت دینا، لوگوں کے لیے اس کا قبول کرنا اور دنیا میں اس کا فروغ پانا ممکن ہے اور اگر وہ اس کی طرف بلانے اور دنیا میں اس کو برپا کرنے کا عزم لے کر اُٹھے گا تو اللہ ضرور اس کام میں اس کی امداد فرمائے گا۔

ایک رحیم و کریم خدا کے متعلق وہ یہ بدگمانی نہیں کر سکتا کہ جس راستہ کی طرف وہ رہبری فرمائے کہ یہ صراطِ مستقیم ہے، اس راستہ پر چلنا ناممکن ہو، اور جس نظامِ زندگی کی بابت وہ فرمائے کہ یہ فطری نظامِ زندگی ہے، وہ اتنا پیچیدہ اور ناممکن العمل ہو کہ لوگ اس کو اختیار ہی نہ کر سکیں۔ نیز ایک عادل اور مہربان پروردگار کے متعلق وہ یہ بدگمانی بھی نہیں کر سکتا کہ وہ اس پر ایک فرض عائد کر کے یہ حکم دے کہ تیرے کرنے کا کام یہ ہے اور اسی کے کرنے میں تیری نجات اور میری خوشنودی ہے، لیکن جب وہ اس کو کرنا شروع کرے اور اس کے سامنے مشکلیں آئیں تو وہ اس کو تنہا بے یار و مددگار چھوڑ دے اور اس کی کوئی مدد کرنے والا نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ حُسنِ ظن اور یہ اعتماد ہر داعیِ حق کے اندر موجود ہوتا ہے اور مخالفین جب اس کی راہ میں روڑے اٹکانے شروع کرتے ہیں اور بظاہر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ کام اب آگے نہیں بڑھے گا، تو یہی اعتماد اس کی ڈھارس بندھاتا ہے کہ جس راستہ کی طرف خود خدا نے انگلی اُٹھا کر اشارہ فرمایا ہے کہ راہِ حق یہ ہے، تو اس پر چلنے والا منزلِ مقصود تک ضرور پہنچ کر رہے گا اور اس راہ میں خواہ کتنی ہی دشواریاں کیوں نہ پیش آئیں، لیکن بالآخر اللہ کی مدد ضرور آ کے رہے گی۔ داعیانِ حق کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہی تعلق اور اعتماد ہے جو سورۂ ابراہیمؑ کی اس آیت سے ظاہر ہو رہا ہے:

وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ	اور کیوں نہ ہم اعتماد کریں اللہ پر، جب کہ
وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا وَلَنَصْبِرَنَّ	اس نے خود ہم پر [illegible] راہیں کھولی ہیں،
عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ	اور ہم صبر کریں گے ان تکلیفوں پر جو تم
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۧ	ہمیں پہنچاؤ گے اور اللہ ہی پر چاہیئے
(ابراہیم ۱۲)	کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی اپنی ذمّہ داری کے حدود معیّن کرنے میں غلطی کر جاتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس پر صرف اسی حد تک ذمّہ داری نہیں ہے کہ وہ حق کو لوگوں تک ٹھیک ٹھیک پہنچا دے بلکہ وہ اس بات کا بھی ذمّہ دار ہے کہ لوگ اس حق کو قبول بھی کر لیں۔

اس غلطی کا لازمی نتیجہ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ داعی کے اندر، حق خالص کو پیش کرنے کی بجائے مخالفین کے باطل عقائد و افکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے، اور دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بالکل غلط ذمّہ داری اپنے سر اٹھا لینے کی وجہ سے اپنی زندگی کو سخت افکار اور الجھنوں میں ڈال دیتا ہے، اس طرح کی غلطیوں سے بچانے کے لیے قرآن مجید نے مفصّل ہدایات دی ہیں۔ مثلاً:

وَمَا عَلَى الَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّلٰكِنْ ذِكْرٰى لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۔

ان لوگوں سے جو خدا سے ڈرتے ہیں ان لوگوں کے اعمال کی پرسش نہ ہوگی جو خدا سے نہیں ڈرتے ۔ بلکہ ان لوگوں کی ذمہ داری، صرف یاددہانی کر دینا ہے تاکہ وہ ڈریں ۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا وَّمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۔ (انعام)

تو پیروی کر اس چیز کی جو تیرے اوپر خدا کی طرف سے اتاری جارہی ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور مشرکوں سے اعراض کر، اگر اللہ چاہتا کہ یہ مشرکین شرک نہ کرنے پائیں تو یہ شرک نہ کرسکتے (لیکن اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں کی ہے) اور ہم نے تم کو ان پر نگراں بنا کر نہیں بھیجا ہے (کہ یہ کوئی غلطی نہ کرنے پائیں) اور نہ تم ان پر وکیل بنا کر بھیجے گئے ہو (کہ ان کے ایمان کے معاملہ کی ذمہ داری تم پر ہو) ۔

فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۔ (رعد)

تمہارے اوپر صرف پوری طرح پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے، حساب کی ذمہ داری ہم پر ہے ۔

طٰهٰ ۚ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ (طٰہٰ، ۳)

ہم نے تم پر قرآن اس لیے نہیں اُتارا ہے کہ تم اپنی زندگی مصیبت میں ڈال لو، یہ تو یاددہانی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں ۔

اس زمانہ میں جو لوگ طاغوت کے عالم گیر تسلّط کی وجہ سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور دعوتِ حق کا کوئی امکان نہیں پارہے ہیں یا دعوتِ حق کے پھیلنے کا امکان نہ پاکر دعوتِ باطل ہی میں لگ گئے ہیں، یہ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔

ان لوگوں کے سامنے اگر یہ حقیقت واضح ہوجاتی کہ ان کی ذمّہ داری صرف " بلاغ " ہے، لوگوں کا ان کی پیش کی ہوئی دعوت کو قبول کرنا یا نہ کرنا اور اس دعوت کا فروغ پانا یا نہ پانا ان سے متعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ معاملہ اللہ تعالےٰ سے متعلق ہے، تو نہ وہ امکان اور عدم امکان کی الجھنوں میں پڑتے اور نہ وہ ایک باطل کو برپا کرنے کی ذمّہ داری اپنے سر لیتے، بلکہ اپنے بس بھر حق کی دعوت دیتے اور اللہ تعالےٰ سے امید رکھتے کہ جب وہ حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے تو اس حق کو ضرور برپا کریگا جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں۔

لیکن انھوں نے اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالےٰ کی ذمّہ داری بھی اپنے کاندھوں پر اُٹھا لینی چاہی، اور جب انھیں اندازہ ہوا کہ یہ بوجھ بھاری ہے، ان سے نہیں اُٹھ سکے گا تو مجبوراً ان کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہر چند خیر و برکت والا نظام تو وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے، لیکن اس زمانہ میں اس کا وسیع پیمانہ پر قیام چونکہ ناممکن ہے، اس وجہ سے اس کے سوا چارہ نہیں کہ ایک غیر اسلامی نظام ہی کی دعوت دی جائے اور اسی کو قبول کرلیا جائے۔

اس خیال کے اندر جو گمراہیاں چھُپی ہوئی ہیں ان سب کو نہ ظاہر کرنے کی ضرورت ہے، اور نہ ان کے ظاہر کرنے کی یہاں گنجائش ہے البتہ ایک بات کی طرف ہم اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان حضرات نے دیدہ و دانستہ حق کی راہ چھوڑ کر باطل کی راہ محض اس خیال سے اختیار کی کہ اس راہ پر چل کر وہ بزعمِ خود آسانی سے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

حالانکہ اس راہ میں بھی کامیابی (جس کو وہ کامیابی سمجھتے ہیں) اگر حاصل ہوگی تو اللہ کے حکم ہی سے ہوگی، نہ کہ خود ان کی سعی وتدبیر سے۔

تو بجائے اس کے کہ وہ ایک باطل راہ پر چل کر اس بات کا انتظار کرتے کہ اللہ تعالے اس راہ میں ان کی رسّی دراز کرے، کیا یہ بہتر نہ تھا کہ وہ خود بھی راہ حق پر چلتے، اور اسی پر چلنے کی دوسروں کو بھی دعوت دیتے، اور اللہ تعالے کی طرف سے توفیق اور کامیابی کے منتظر رہتے ہے۔

یہ خطرناک غلطی جس نے ان کی ساری جدوجہد کو ایک بالکل غلط راہ پر لگا دیا، صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ بحیثیت داعی انھوں نے اپنی ذمہ داری کے حدود کو ٹھیک ٹھیک معیّن نہیں کیا۔ انھوں نے اپنا فرض صرف اس قدر نہیں سمجھا کہ جس حق کی طرف اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت کی ہے اس حق کو بلاکم وکاست لوگوں تک پہنچا دیں۔ بلکہ اپنا فرض یہ بھی سمجھا کہ لوگوں کو اس کا معتقد بھی بنا دیں۔ اور جب یہ کام انھیں بہت مشکل نظر آیا تو انھوں نے حق کو چھوڑ کر باطل ہی کو اختیار کر لیا، کہ لوگ آسانی سے اس کے معتقد بن سکیں گے۔ یہ غلطی لازمی طور پر ایک داعی کو رحمان کے راستہ سے ہٹا کر شیطان کے راستہ پر ڈال دیتی ہے، اور وہ صرف داعی ہی نہیں رہ جاتا کہ بلکہ مدّعی بن کر خدا کے حقوق میں دراندازی کرنے والا اور ایک نیا دین پیش کرنیوالا بن جاتا ہے۔

ایک داعی اگر اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہچانتا ہے تو اس سے اس بات کا اندیشہ تو نہیں ہو سکتا کہ وہ مایوس اور بددل ہو کر بیٹھ رہے، یا حق کی جگہ باطل ہی کی دعوت شروع کر دے۔ البتہ اس کو اس پہلو سے اپنی نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں اس خیال کی وجہ سے کہ اس کے اوپر صرف بلاغ ہی کی ذمہ داری ہے۔ اس کے اندر بے پروائی اور سہل انگاری نہ پیدا ہو جائے۔ اپنے آپ کو اس چیز سے بچانے کے لیے اس کو

ہمیشہ ان ذمہ داریوں کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو داعی پر بحیثیت داعی عائد ہوتی ہیں، اور جن کا لحاظ نہ رکھنے کی صورت میں ڈر ہے کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں اس سے مواخذہ ہو جائے کہ اس نے تبلیغ یا ادائے شہادت کا فرض اس طرح ادا نہیں کیا جس طرح اُس کو ادا کرنے کا حق تھا۔

حضرات انبیاء علیہم السلام کا جہاں تک تعلق ہے ان کو فرض رسالت کی تمام ذمّہ داریوں کا اس درجہ شدید احساس ہوتا تھا کہ وہ بسا اوقات نہ اپنے ضروری آرام کا خیال کرتے، نہ اپنی اور اپنی دعوت کی عزّت وشان کا بلکہ ان کے غیر معمولی انہماک سے ایسا ظاہر ہوتا کہ گویا وہ اپنے آپ کو لوگوں کے کفر و ایمان کا ذمّہ دار سمجھ رہے ہیں۔ اس انہماک پر اللہ تعالےٰ نے انبیاء علیہم السلام کو محبّت آمیز انداز میں ٹوکا ہے۔ جس کی بعض مثالیں ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، یہی انہماک، افراط و تفریط سے بچ کر ہر داعیِ حق کی خصوصیّت ہونا چاہیے۔

دعوتِ حق کے مخالفین

ہر دعوتِ حق کو عموماً تین طرح کے مخالفین سے سابقہ پڑتا ہے۔

——— مُعَانِدین
——— مترَبِّصین
——— مُغَفَّلین

ان میں سے ہر گروہ کی خصوصیات وصفات اور ان کی نفسیات الگ الگ ہیں۔ اس وجہ سے ایک حکیم داعی کو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ بالکل علیحدہ علیحدہ معاملہ کرنا پڑتا ہے، اور بہت بڑی حد تک دعوت کی کامیابی کا انحصار اسی فرقِ معاملہ پر ہے۔ اگر ایک داعی ان مختلف جماعتوں میں امتیاز کرنے اور ان کے مخصوص محرکات ومیلانات کے پہچاننے میں قاصر رہ جائے تو اس کی دعوت کا کامیابی سے ہم کنار ہونا مشکل ہے۔ مسئلہ کی اس اہمیت کی وجہ سے ہم چاہتے ہیں کہ ان تمام جماعتوں کی امتیازی خصوصیات اور ان کے ذہنی میلانات کی تشریح کریں۔

۱۔ مُعَانِدین

معاندین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوت کے اثر کا اندازہ کرتے ہی اس کی

مخالفت کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آتا ہے۔ ان کی مخالفت کی تہہ میں یوں تو مختلف قسم کے محرکات کام کرتے ہیں، لیکن تین محرک اصلی اور بنیادی ہیں۔ ایک حمیّتِ جاہلیّت دوسرا استکبار اور حسد، تیسرا مفاد پرستی۔ یہ تینوں محرکات حق کی مخالفت میں پیشقدمی کے اعتبار سے تو بالکل یکساں نوعیّت کے ہیں۔ لیکن اپنی رُوح کے اعتبار سے بالکل مختلف ہیں۔

حمیّتِ جاہلیّت کی بیماری درحقیقت نظامِ جاہلی کے ساتھ اخلاص ووفاداری کا نتیجہ ہے۔ اس بیماری میں بالعموم وہ لوگ مبتلا ہوتے ہیں جو اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے مخلص اور وفادار خادم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوت ایسی اُٹھ رہی ہے جو اس نظام کو جس کے وہ علم بردار ہیں، توڑ پھوڑ کر اس کی جگہ کوئی نیا نظام برپا کرنا چاہتی ہے، تو ان کے اندر ایک ہیجان برپا ہو جاتا ہے۔ ان کو اس میں اپنی قوم کی سیاسی ومعاشی تباہی نظر آتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس سے ان کے قبیلہ میں پھوٹ پڑ رہی ہے اور ان کی بنی بنائی جمعیت منتشر ہوئی جا رہی ہے وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ یہ دعوت باپ دادا کے معروف طریقہ اور پُرانی روایات کے بالکل خلاف ہے۔ اس وجہ سے ان کا دل اس سے کڑھتا ہے۔ یہ ساری باتیں مل ملا کر ان کے اندر داعی اور دعوت کے خلاف ایک سخت قسم کا غم وغصہ پیدا کر دیتی ہیں اور وہ پورے جوش کے ساتھ اس کی مخالفت میں لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

لیکن چونکہ ان کی یہ مخالفت بیشتر قومی اخلاص پر مبنی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس میں کمینہ پن اور رذالت کا شائبہ کم ہوتا ہے۔ یہ ایک مردانہ مخالفت ہوتی ہے۔ جس میں جوش تو ہوتا ہے لیکن یہ جوش شرافت سے عاری نہیں ہوتا۔ اس طرح کی مخالفت میں اس کا امکان موجود رہتا ہے کہ غلط فہمیاں رفع ہونے کے بعد یہ عداوت،

محبّت سے بدل جائے۔ اور اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ محبّت بھی ویسی ہی پُرجوش اور طاقتور ہوتی ہے۔ جیسی پُرجوش اور طاقتور عداوت ہوتی ہے۔

اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس کی بہترین مثال ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مخالفت ہے۔ ابوجہل دعوتِ اسلام کی مخالفت میں آخر دم تک جس درجہ سرگرم رہا ہر شخص کو معلوم ہے۔ لیکن اس شدید عناد کے باوجود اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی رکیک الزام لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ جب آپؐ دعوت کے لئے نکلتے تو جوشِ مخالفت میں سایہ کی طرح آپؐ کے ساتھ ساتھ ہوتا، تاکہ کوئی آپؐ کی بات سُننے نہ پائے۔ لیکن جب مخالفت کرتا تو اس کا یہ انداز ہوتا کہ:

"اے محمدؐ! میں یہ تو نہیں کہتا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو، لیکن تمہاری دعوت باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے۔" اس کو سب سے زیادہ غصّہ اس بات پر تھا کہ اسلامی دعوت قریش کی جمعیت کو پارہ پارہ کر رہی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے بڑا الزام جو وہ لگاتا تھا وہ یہ تھا کہ آپؐ نے بیٹے کو باپ سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر کے ان کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا، چنانچہ بدر کے معرکہ کے موقع پر جب اس نے دیکھا کہ اسلامی دعوت نے قریش کو قریش ہی کے خلاف صف آراء کر دیا ہے تو اس نے پورے جوش کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی:

اَللّٰهُمَّ اقطعنا للرحم وآتانا بما لا يعرف فاحنه الغداة۔

(اے خدا! ہم میں سے جو سب سے زیادہ رشتۂ رحم کا توڑنے والا اور اس بدعت کا باعث ہوا ہو اس کو کل شکست دیجیو)۔

یہ دعا اگرچہ حمیّتِ جاہلیت کے زہر میں بُجھی ہوئی ہے لیکن اس میں ابوجہل کی شرافتِ نفس اور قوم پرستی کا جو پہلو نمایاں ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس

طرح کے مخالفین اگرچہ دعوت کی مخالفت میں کتنے ہی سرگرم ہوں، اپنے اندر ایک جوہر قوم پرستی کا رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک داعئ حق کی نظروں میں ان کی ایک وقعت ہوتی ہے۔ اور وہ اس بات کا دل سے آرزومند ہوتا ہے کہ ان کا یہ جوہر باطل کی جگہ حق کی خدمت میں استعمال ہو۔

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلامی کے تمام مخالفین میں سے خصوصیت کے ساتھ ابوجہل اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام کے لیے دعا کی۔ تاکہ ان کے قبولِ اسلام سے اسلام کی دعوت کو قوت و عزت حاصل ہو، آپؐ کی یہ دعا حضرت عمرؓ کے بارے میں قبول ہوئی۔ اور اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ان کے اسلام لاتے ہی دفعتہً حالات کچھ سے کچھ ہو گئے۔

قبول اسلام سے پہلے حضرت عمرؓ جس جوش، جس سرگرمی اور جس ہمت و حمیت کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کر رہے تھے۔ اسلام لانے کے بعد اس سے کہیں زیادہ اولوالعزمی اور مردانگی کے ساتھ اسلام کے لیے جاں نثاریاں کرنے لگے۔ ان کی جاہلی حمیت کے اسلامی رنگ اختیار کرتے ہی دوست دشمن ہر شخص کو محسوس ہونے لگا کہ اب اسلام کی صف میں ایک شیر دل مردِ حق آگیا ہے۔

حضرت عمرؓ کی سیرت کے اندر وہ جوہر موجود تھا جو انسان کی تمام اعلیٰ صفات کے لیے خمیر کا کام دے سکتا ہے، لیکن یہ جوہر بہت سے جاہلی تصوّرات کے نیچے دبا ہوا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ حق کی رگڑ سے جب ان باطل تصوّرات کا میل اُڑ گیا تو نیچے سے وہ کھرا سونا صاف نکل آیا۔ جس کی چمک نے بالآخر دنیا کی نگاہیں خیرہ کر دیں۔

اپنے عہد کے نظامِ جاہلی کے ساتھ حضرت عمرؓ کی وابستگی خودغرضانہ اور مفاد پرستانہ نہیں تھی، بلکہ اسلام لانے سے پہلے اسی نظامِ باطل کو وہ حق سمجھتے تھے۔

اسی کو اپنے مقدس باپ اور دادا کا ورثہ خیال کرتے تھے۔ اُسی کے اندر اپنی قومی عزّت کا بقا سمجھتے تھے۔ اور ان تمام وجوہ سے وہ اپنا یہ دینی اور قومی فرض سمجھتے تھے، کہ اس کے بہی خواہوں کے بہی خواہ، اور اس کے مخالفوں کے دشمن ہوں لیکن جب ان پر یہ بات واضح ہوگئی کہ حقیقت وہ نہیں ہے جو وہ سمجھ رہے ہیں۔ بلکہ اس کے بالکل برعکس ہے، تو اسی جذبے نے، جو ان کو نظامِ جاہلی کا پُرجوش خادم بنائے ہوئے تھا، ان کو اسلام کی خدمت و اعانت کے لیے سربکف کر دیا۔ اس طرح کی سیرت رکھنے والے اشخاص ادنیٰ درجہ کی خودغرضیوں سے بالاتر ہونے کی وجہ سے نہ تو کسی حقیقت کے واضح ہوجانے کے بعد اس کے انکار پر اڑتے، اور نہ کسی چیز کو اختیار کر لینے کے بعد اس کے واجبی حقوق اور مطالبات ادا کرنے سے جی چراتے، بلکہ ایک امر کے حق ثابت ہوجانے کے بعد اس کو قبول کرنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔ اور اس کے لیے اپنے ہر طرح کے ذاتی مفاد قربان بھی کر سکتے ہیں۔

ان کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں اپنا ایک خاص درجہ اور مقام رکھتے ہیں۔ اس گروہ میں مختلف ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض کی حمیّت اپنے حدود سے گزر کر انانیت اور خود پرستی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور ان کو آخر دم تک جاہلیّت کے پھندے سے نکلنا نصیب ہی نہیں ہوتا، جیسے ابوجہل۔ بعض تھوڑی سی کش مکش کے بعد کسی معمولی سی تنبیہ سے متنبہ ہو کر راہِ حق پا لیتے ہیں، جیسے حضرت عمرؓ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما۔

بعض جاہلیّت کے غلاف سے نکلنے میں بڑی دیر لگاتے ہیں۔ جیسے ابوسفیانؓ

لیکن ایک وصف ان سب میں مشترک ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب یہ جاہلیت کو چھوڑ کر اسلام اختیار کرتے ہیں تو آتے ہی اسلام کی صفِ اوّل میں اپنی جگہ اسی طرح بنا لیتے ہیں، جس طرح کل تک وہ جاہلیّت کے صفِ اوّل میں تھے۔ خیارکم فی الجاھلیۃ

خیارکم فی الاسلام۔

استکبار اور حسد کی وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت بالعموم وہ لوگ کرتے ہیں، جو روایتی دین داری یا موروثی مالداری کی وجہ سے نظامِ جاہلی کے اندر پیشوائی اور سرداری کے مقام پر متمکن ہوتے ہیں۔ یہ لوگ آگے چلتے رہنے کی وجہ سے آگے چلنے کے ایسے عادی ہوجاتے ہیں کہ حق کے پیچھے چلنے میں بھی انھیں عار محسوس ہوتا ہے، اور وہ بجائے اس کے کہ حق کے پیچھے چلیں۔ کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ حق کو اپنے پیچھے چلائیں۔

موروثی دین داروں کی ذہنیت بالعموم یہ ہوتی ہے کہ وہ حق کو اپنے باپ دادا کی میراث اور اپنی ذاتی جائداد خیال کرنے لگ جاتے ہیں، اور عقیدت و احترام کے ماحول میں پلنے اور بڑھنے کی وجہ سے وہ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کرسکتے کہ حق ان کی ذات اور ان کے حلقہ سے باہر بھی پایا جاسکتا ہے۔ موروثی مالداروں کا حال یہ ہے کہ وہ دنیوی شان وعظمت کو اپنے برحق ہونے کی دلیل ٹھہرالیتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ جب انھیں عزّت وعظمت حاصل ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ ان ہی کا فکر اور انھیں کا عمل حق بھی ہے۔ اس طرح کی ذہنیت کے لوگوں کو جب کوئی ایسی دعوت چیلنج کرتی ہے جو ان کی روایتی دین داری کے خلاف ہوتی ہے، یا جس کی زد ان کی خواہشوں پر پڑتی ہے، تو یہ تلملا کے اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بالخصوص اس صورت میں ان کی مخالفت بہت ہی سخت و شدید ہوجاتی ہے۔ جب یہ دعوت ان کے حلقہ کے سوا کسی اور حلقہ سے بلند ہوئی ہو، یہ لوگ اس غرور میں مبتلا ہوتے ہیں کہ حق ہمارے ساتھ ہے اور ہمیشہ ہمارے ساتھ ہی رہے گا، اور اگر بالفرض ہمارے اندر سے غائب بھی ہوجائے تو جب کبھی بھی اس کو دنیا پر ظاہر ہونا ہے، ہمارے ہی واسطہ سے ظاہر ہوگا۔ اس غرور کے ساتھ ظاہر

ہے کہ کسی ایسے حق کا قبول کرنا ان لوگوں کے لیے تقریباً ناممکن ہے، جس کے داعی وہ خود نہ ہوں۔

چنانچہ دعوتِ حق کی پوری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی کہ جو لوگ اس مرض میں مبتلا رہتے ہیں ان کو حق پر ایمان لانے کی بہت کم ہی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ مکّہ اور طائف کے وہ سردار جو کہتے تھے، کہ اللہ تعالےٰ کو اگر کوئی نبی بھیجنا ہی ہوتا تو وہ ہمارے اندر سے کسی کو بھیجتا، اسی بیماری میں مبتلا تھے،

یہی لوگ تھے جو اسلام کے حق اور اس کے ایک نعمتِ الٰہی ہونے کے اس بنا پر منکر تھے کہ اگر یہ حق اور اللہ کا اُتارا ہوا دین ہوتا تو ہو نہیں سکتا تھا کہ ہم سے پہلے یہ رذیل اور فاقہ مست لوگ اس کو پاتے، ان ہی لوگوں کے ساتھ یہود بھی شریک تھے۔ جن کی اسلام کے ساتھ ساری عداوت و مخالفت کی تہہ میں صرف یہ جذبہ یہ کام کر رہا تھا کہ اگر وہ اس حق کو مانے لیتے ہیں تو ان کی دینی پیشوائی کی ساری عزّت و فضیلت، خاک میں مل جاتی ہے۔ اس طرح کے لوگ اگرچہ بعض اعتراضات و شبہات بھی دعوتِ حق کے خلاف پیش کرتے ہیں، تاکہ اپنی مخالفت کو جائز اور معقول ثابت کر سکیں، لیکن حقیقت میں یہ سارے اعتراضات و شبہات محض اصل محرکِ مخالفت ـــــ استکبار و حسد ـــــ پر پردہ ڈالنے کے لیے گڑھے جاتے ہیں۔

اس طرح کے مخالفین ایک داعئ حق کے لیے اپنے اندر اُمید سے زیادہ مایوسی کا پہلو رکھتے ہیں۔ ان میں بہت تھوڑے نکلتے ہیں۔ جن کو قبولِ حق کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ یہ اپنے استکبار کی وجہ سے اپنے آپ کو اُلوہیت کے منصب پر سرفراز کر لیتے ہیں، اور اس منصب کو چھوڑنا اس وقت تک گوارا نہیں کرتے جب تک اس کو چھوڑنے پر مجبور نہ کر دیئے جائیں۔

قرآن مجید میں استکبار کو قبولِ حق کے سب سے بڑے موانع میں سے شمار کیا گیا ہے، اور اسی وجہ سے جگہ جگہ قرآن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے پیچھے زیادہ وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو دنیوی مال و متاع کی فراوانی یا مذہبی و دنیوی ریاست کی وجہ سے اپنے غرور میں سرمست ہیں۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے وقت کے فقیہوں اور فریسیوں کے غرور ہی کی بنا پر فرمایا تھا کہ " مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، آسمان کی بادشاہی میں وہی داخل ہوں گے۔" نیز فرمایا تھا کہ

" اونٹ کا سوئی کے ناکے میں جانا آسان ہے، مگر دولت مند خدا کی بادشاہی میں نہیں داخل ہو سکتا۔" بعد کے واقعات نے اس پیشین گوئی کی پوری تصدیق کر دی۔ انجیل اور قرآن مجید دونوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی دعوت پر یروشلم کے علماء اور فقہا میں سے ایک شخص بھی ایمان نہیں لایا۔ یہاں تک کہ ان سے مایوس ہو کر حضرت کو دریا کے کنارے ماہی گیروں کے سامنے اپنی دعوت پیش کرنی پڑی، اور ان ہی کے اندر سے اللہ کے کچھ بندے ان کو ایسے ملے جنہوں نے دعوتِ حق کے اس کام کو سنبھالا۔

کم و بیش یہی صورتِ حال اس وقت پیش آئی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بلند ہوئی۔ اہلِ کتاب کے پیشوایانِ دینی میں سے صرف گنتی کے چند نفوس اسلام لائے، بقیہ سارے کے سارے اپنی پیشوائی اور مشیخیت کے غرور میں حق کی مخالفت پر اڑے رہے۔ جو لوگ ایمان لائے ان کی صفات جہاں قرآن مجید نے گنائی ہیں وہاں ان کی سب سے نمایاں صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ

وَاِنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ (مائدہ) اور وہ گھمنڈ نہیں رکھتے۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جن کے دلوں کو مذہبی اور دنیوی ریاست

کا کوئی روگ نہیں لگا تھا، اور وہ اپنے آپ کو حق سے بالاتر نہیں سمجھتے تھے۔ اس گروہ کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ شروع شروع میں یہ اپنے استکبار کی وجہ سے دعوت کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، اور اس کی طرف کچھ توجہ نہیں کرتا۔ لیکن جب دعوت بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے اور ان کو اپنے پاؤں کے نیچے کی زمین کھسکتی نظر آتی ہے تو ان پر حسد کا سخت دورہ پڑتا ہے۔ اس وقت وہ داعی اور دعوت کی مخالفت میں وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں جو ایک مبتلائے حسد گروہ کر سکتا ہے۔

مفاد پرستی کی وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت وہ لوگ کرتے ہیں جن کا اخلاقی تصور حُبِّ ذات سے آگے نہیں بڑھتا۔ ان کا سارا اخلاق و اجتماعی فلسفہ اپنی ذات سے شروع ہوتا ہے اور پھر برابر اسی محور پر گھومتا رہتا ہے۔ یہ محض انسان کی اس فطری مجبوری کی وجہ سے کہ وہ ایک اجتماعی وجود ہے، جو تنہا زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ کسی اجتماعی نظام کے اندر شامل تو ہوتے ہیں لیکن اس کے اندر ہر قدم پر صرف استحقاق تلاش کرتے ہیں، کسی جگہ بھی ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک حق اور باطل کا معیار ان کی اپنی ذات ہے۔ جس چیز سے اُن کی ذات کا بھلا ہو وہ حق ہے، اور جس چیز سے ان کے کسی ذاتی مفاد کو ٹھیس لگ رہی ہو وہ باطل ہے۔

جن لوگوں کا اخلاقی اور اجتماعی تصور اتنا پست ہو، وہ لازماً ہر اس دعوت کی مخالفت کرتے ہیں جس سے ان کی مفاد پرستی کا یہ گھنوناپن دوسروں کے، یا خود ان کے سامنے واضح ہو رہا ہو۔ اس طرح کے لوگ ان تمام جوہری صفات سے بالکل عاری ہوتے ہیں جن سے ایک اعلیٰ سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کسی نظامِ حق کے لیے ان کا وجود فطری طور پر ویسا ہی نکما ہے جس طرح ایک عنین

کا وجود ایک عورت کے لیے۔ یہ اپنی طبعی پست اخلاقی اور دنائت کی وجہ سے کسی فاسد دعوت اور فاسد نظام ہی کی طرف میلان رکھتے ہیں، اور اس کے ساتھ بھی ان کی وابستگی بالکل منافقانہ اور خود غرضانہ ہی ہوتی ہے۔ اس کے لیے اپنے دلی جوش و جذبہ کے ساتھ ایک چوٹ بھی کھانے کے لیے وہ تیار نہیں ہوتے۔ اسلامی دعوت کی تاریخ میں اس کی نہایت حقیقت افروز مثال ابولہب کا وجود ہے۔ جس کا آنحضرتؐ کی دعوت سے سارا اختلاف محض اس وجہ سے تھا کہ آپؐ کی دعوت سے اس کی سیرت کے تمام بدنما پہلو لوگوں کے سامنے آرہے تھے، اور اپنی خود غرضی اور زر پرستی سے اس نے جو دولت اکٹھی کر رکھی تھی وہ سب معرض خطر میں تھی۔

یوں تو وہ قریش کے قائم کردہ نظام جاہلی میں سب سے اونچے عہدہ پر فائز تھا۔ لیکن اس نظام کے ساتھ اس کی ساری وابستگی محض اس وجہ سے تھی کہ منصب رفادہ اور خانۂ کعبہ کی کلید برداری کی وجہ سے اس کو مالی دستبرد کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اس کے آگے نہ تو اس کو اپنی قوم ہی سے کوئی ہمدردی تھی اور نہ اس نظام کے خیر و شر ہی سے کوئی دلچسپی تھی جس کا وہ سب سے بڑا لیڈر تھا۔ اس کا سب سے واضح ثبوت یہ ہے کہ یوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں آگے آگے رہتا، اور لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کرتا کہ یہ آباء و اجداد کے قائم کردہ نظام کو برباد کر دینے والی دعوت ہے۔

لیکن بدر کے موقع پر، جو قریش کے نقطۂ نظر سے ایک فیصلہ کن معرکہ تھا اور جس میں ان کے تمام سردار پورے جوش دینی کے ساتھ شریک ہوئے، وراثتِ ابراہیمی کا یہ سب سے بڑا دعویدار گھر میں بیٹھا رہا اور کرایہ کے ایک آدمی کو اپنی طرف سے میدان میں لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح کے لوگوں کا ہر دعوتِ حق کے ساتھ فطری تعلق صرف مخالفت ہی کا ہو سکتا ہے اور مخالفت ہی کا ہوتا ہے،

یہ دنائت اور رذالت میں اتنے پختہ اور مشّاق ہو جاتے ہیں کہ کوئی ایسی دعوت جو مکارم اخلاق کی طرف بلا رہی ہو۔ جو ہمدردی، مساوات اور اخوت کا مطالبہ کر رہی ہو۔ جو ایثار، قربانی اور جاں نثاری کے لیے پکار رہی ہو۔ ان کو اپیل کر ہی نہیں سکتی۔ اس قسم کی دعوت کے لیے ان کے کان بہرے اور ان کے دل مردہ ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس کی طرف اپنے اندر کوئی میلان نہیں پاتے، بلکہ اس سے نفرت اور کراہت محسوس کرتے ہیں۔

اس طرح کے لوگوں کی مخالفت بھی ان کی اخلاقی پستی کی وجہ سے نہایت رذیل اور کمینہ مخالفت ہوتی ہے، یہ علانیہ اور اصولی مخالفت کے بجائے بالعموم چغلی، بدگوئی پر اُتر آتے ہیں، اور ہمز و لمز کے ذریعہ سے اپنی لیڈری کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

۲۔ مُتربّصین

متربّصین سے مراد وہ گروہ ہے جو دعوتِ حق کا حق ہونا تو کسی حد تک محسوس کر لیتا ہے۔ لیکن نہ تو اس کے اندر اتنی اخلاقی ہی قوّت ہوتی کہ وہ حق کو مجرّد اس بنا پر کہ وہ حق ہے، قبول کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا سکے، اور نہ عقلی اعتبار سے ہی یہ لوگ اتنے بلند ہوتے کہ نظامِ حق کے عملاً برپا ہو جانے سے پہلے کامیابی کے ان امکانات کا اندازہ کر سکیں، جو حق کے اندر مضمر ہوتے ہیں۔

اس کمزوری کی وجہ سے یہ گروہ بجائے اس کے کہ کسی حق کے حق ہونے کا فیصلہ اپنی عقل سے کرے، اس معاملہ کو مستقبل کے حوالہ کر کے انتظار کرتا ہے کہ اگر مستقبل نے اس کی کامیابی کا فیصلہ کر دیا تو اس کا ساتھ دیں گے، ورنہ زندگی جس نہج پر گزر رہی ہے گزرتی جائے گی۔ یہ لوگ اپنی اخلاقی کمزوری اور عقلی ضعف

کی وجہ سے ایک ذہنی کش مکش اور تردّد و تذبذب کی حالت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے دعوتِ حق کی مخالفت میں یہ بہت سرگرم نہیں ہوتے۔ لیکن وقت کے نظامِ غالب کے اثر سے ساتھ مخالفینِ دعوت ہی کا دیتے ہیں اور حق و باطل کی کشمکش کے ہر مرحلہ میں زیادہ تر ان کی کوشش اس بات کے لیے ہوتی ہے کہ کوئی صورت سمجھوتے کی پیدا ہو جائے کہ حق و باطل دونوں ساتھ ساتھ مل کر چل سکیں۔ یہ لوگ ایک بڑی حد تک منکرینِ حق کے گروہ میں وہی پوزیشن رکھتے ہیں جو موافقینِ حق کے گروہ میں منافقین کا ہوا کرتا ہے، اور اپنی اخلاقی کمزوری کی وجہ سے حق کی بڑی سے بڑی کامیابی کے بعد بھی ان کا تربّص اور انتظار ختم نہیں ہوتا۔

ابتدائے دعوتِ اسلام میں جو لوگ اس طرح کی ذہنی حالت رکھنے والے تھے وہ بدر کے موقع پر یہ کہتے تھے کہ اگر اس معرکہ میں محمّد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو کامیابی ہوئی تو ہم مان لیں گے کہ ان ہی کی دعوت حق ہے اور ان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب یہ معرکہ سر ہو گیا اور اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو غالب کیا تو انھوں نے اپنے معاملہ کا فیصلہ آئندہ لڑائیوں کے نتائج پر ملتوی کر دیا۔ ان جنگوں کا فیصلہ بھی جب قریش کے خلاف ہی نکلا اور عملاً قریش کی فوجی قوت بالکل ٹوٹ گئی تو یہ اس بات کا انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں یہود کی منظم طاقت سے اسلام کا مقابلہ کیسا رہتا ہے؟۔ جب یہود کی طاقت بھی درہم برہم ہو گئی تو ان کا انتظار ختم ہو جانا تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی ان کی ایک جماعت باقی رہی، جو اس تصادم کے نتیجہ کا انتظار کرنے لگی جو رومیوں اور مسلمانوں میں برپا ہونے والا تھا۔ اس طرح یہ لوگ ایک غیر مختتم انتظار میں مبتلا رہے اور اس وقت تک ایمان نہیں لائے جب تک ان کے لیے کفر پر قائم رہنا ناممکن نہیں ہو گیا۔

اس گروہ کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ لوگ حق کو عقل سے پرکھ کر اس

پر ایمان لانا نہیں چاہتے۔ بلکہ اس کے غلبہ کو آنکھوں سے دیکھ کر اس پر ایمان لانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ یہ خواہش بعینہ اسی طرح کی خواہش ہے جس کا اظہار ان لوگوں کی طرف سے ہوا ہے جو خدا پر ایمان لانے سے پہلے اس کو دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔ یہ خواہش ایک طفلانہ خواہش ہے اور خدا اور اس کے رسول ؐ نے کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی ہے۔

بلکہ صاف صاف یہ فرمایا ہے کہ ایمان صرف وہ معتبر ہے جو عقل سے سمجھ کر لایا جائے نہ کہ آنکھوں سے دیکھ کر۔ جو شخص ایک حق کو حق اس لیے مانتا ہے کہ اس کے اچھے نتائج وثمرات اس کے سامنے موجود ہیں۔ یا اس کی مخالفت کے بُرے نتائج وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ وہ درحقیقت حق پر ایمان نہیں لایا ہے، بلکہ وہ یا تو فوائد کی پوجا کر رہا ہے یا نقصانات کے ڈر سے سہما ہوا ہے۔ جو انسان ظاہر پرستی کے اس درجہ تک گر جاتا ہے اس میں اور ایک حیوان میں صرف صورت کا فرق رہ جاتا ہے۔ اس کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس دنیا میں کسی ایسے ضابطہ اخلاق کا پابند رہ سکے، جس کے نتائج آج نہیں، بلکہ کل ظاہر ہونے والے ہیں یہی رمز ہے کہ اس ٹائپ کے لوگ داعیانِ حق کے نقطۂ نظر سے کوئی بڑی قیمت نہیں رکھتے۔ ان کی ذہنیت مقلدانہ ذہنیت ہوتی ہے۔ یہ چلتی گاڑی پر سوار ہونے کے عادی ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کسی سمت کو جا رہی ہو۔ یہ کفر کے ساتھی ہیں اس وجہ سے کہ کفر غالب ہے۔ اسلام کا بھی ساتھ دیں گے اگر اسلام غالب ہو جائے۔ ان کے اندر وہ مردانِ کار نہیں ہوتے جو حق کی طرف اپنی اندرونی کشش سے کھنچ کر آئیں۔ بلکہ یہ طاقت کے دباؤ سے مجبور ہو کر آتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے کہ اس کے لوگوں سے جماعت کی قوت بڑھتی نہیں بلکہ گھٹتی ہے۔ ابتدائے اسلام میں جو لوگ ایمان لائے تھے ان کی قوت کا یہ حال

تھا کہ ان کا ایک فرد دس کا فروں پر بھاری تھا۔ لیکن جب ان مسلمانوں کے ساتھ فتح مکّہ کے بعد اسلام لانے والوں کا جم غفیر بھی شامل ہوگیا تو یہ توڑ گھٹ کر صرف ایک اور دو کی نسبت رہ گئی۔

اپنے عقلی اور اخلاقی ضعف کی وجہ سے اس ذہنیت کے لوگ کبھی کسی دعوتِ حق پر اُس دَور میں ایمان نہیں لاسکتے، جس دَور میں وہ کش مکشوں اور آزمائشوں سے گزر رہی ہو۔ یہ ممکن ہے کہ یہ اس کے حق میں چوری چھُپے کوئی کلمۂ خیر کہہ دیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے دل کے مخفی گوشوں میں اس کی کامیابی کی کوئی خواہش پیدا ہو جائے، یہ بھی متوقع ہے کہ وہ ان لوگوں کو کچھ اچھا نہ سمجھیں جو دعوت کی مخالفت میں پیش پیش ہوں۔ بلکہ ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اس طرح کے لوگ کبھی کبھی دعوتِ حق کی مالی یا اخلاقی مدد کا حوصلہ کرلیں۔

یہ ساری باتیں ممکن ہیں، لیکن یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ لوگ اس بات کی ہمت کرلیں کہ ٹوٹے ہوئے تختوں کو جمع کریں ان کو جوڑ کر کشتی بنائیں، اس کشتی کو منجدھار میں ڈال دیں اور بادِ مخالف سے لڑ کر اس کو ساحلِ مراد پر پہنچانے کی کوشش کریں۔ ان کی ذہنی حالت دعوت کے مختلف سازگار اور ناسازگار حالات کے لحاظ سے متغیّر ہوتی رہتی ہے۔ کبھی دعوت کی کامیابی کے آثار دیکھ کر ان کے دلوں میں گدگدی پیدا ہو جاتی ہے کہ آگے بڑھ کر خود بھی اس کو قبول کرلیں۔ کبھی مشکلات و مصائب دیکھ کر بالکل سہم جاتے ہیں، اور دعوت کو حماقت اور داعی کو بے خرد اور مجنون قرار دینے لگتے ہیں۔

لیکن ایسا کم ہوتا ہے کہ معاندین کے سے جوش کے ساتھ اس کی مخالفت اور بیخ کنی پر آمادہ ہو جائیں، یا کھلّم کھلّا اس پر ایمان لاکر اس کی حمایت و نصرت کے لیے سربکف ہو جائیں، یہ اس کی تباہی بھی چاہتے ہیں، تو اس طرح نہیں کہ

اس کو تباہ کرنے کے لیے خود انھیں کوئی خطرہ مول لینا پڑے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ کشتی کسی چٹان سے ٹکرا کر خود بخود پاش پاش ہو جائے۔ اسی طرح اگر اس کی کامیابی کی آرزو کرتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ اس راہ میں انھیں کوئی جوکھم برداشت کرنا پڑے بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ دوسرے اس کے لیے جان و مال کی قربانیاں کر کے اس کو پروان چڑھائیں اور یہ اس کا پھل کھائیں۔

۳۔ مُغفلین

مغفلین سے مراد عامۃ النّاس کی وہ بھیڑ ہے جن کو اپنی روٹی اور روزمرّہ کی ضروریات کی فراہمی سے کبھی اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ وہ سوسائٹی کے بناؤ اور بگاڑ کے کاموں میں قائدانہ حیثیت سے کوئی حصّہ لے سکیں۔ یہ ذہنی اور معاشی دونوں اعتبار سے اپنے وقت کے نظام کے تابع بلکہ اس کے قلی ہوتے ہیں۔ اور اس کے تحت جیتے رہنے ہی کو ایک بڑی نعمت اور ان لوگوں کا فضل و احسان سمجھتے ہیں، جن کی قیادت میں یہ نظام چل رہا ہوتا ہے۔ یہ لوگ بالعموم ان اخلاقی مفاسد سے پاک ہوتے ہیں جن میں معاندین کا گروہ مبتلا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے کسی دعوتِ حق کی مخالفت میں سرگرمی کے ساتھ نہ یہ حصّہ لیتے اور نہ ان کے حصّہ لینے کی کوئی وجہ ہے۔

لیکن یہ اپنے وقت کے دینی و سیاسی پیشواؤں کے مقلّد اور مرید ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ایک موروثی حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس وجہ سے کوئی ایسی بات جو ان کے ائمۂ سیاست و مذہب کے مسلک کے خلاف ہو ان کے دل کو اولاً تو لگتی نہیں اور اگر لگتی بھی ہے تو شروع شروع میں وہ اس سے بیگانگی سی محسوس کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ان کے ائمہ قدم اُٹھائیں تو یہ ان کے ساتھ چلیں۔

ان کے ائمہ ان اسباب کی وجہ سے، جو اوپر بیان ہوئے، موافقت کے بجائے مخالفت کی راہ میں قدم اٹھاتے ہیں اور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے ساتھ اپنے پیروؤں کو بھی لے چلیں۔

یہ وقت ہوتا ہے کہ یہ گروہ دعوت سے واقف ہونا شروع ہوتا ہے اور درجہ بدرجہ حق و باطل کی یہ کش مکش جتنی ہی بڑھتی جاتی ہے عامۃ النّاس اتنے ہی اس سے قریب ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اس کش مکش میں ان کو داعی کے بے لوث کیریکٹر اور اس کی دعوت کی دل پذیری کا بطور خود اندازہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر کچھ ذہین اور اخلاقی جرأت رکھنے والے اشخاص دعوت کے حامی بن جاتے ہیں۔

وقت کے ارباب کار جب دیکھتے ہیں کہ ان کے پیرو اُن کے ہاتھ سے نکل چلے ہیں تو وہ دعوت اور داعی کی مخالفت میں پوری قوت کے ساتھ میدان میں اُتر آتے ہیں۔ اور عوام کو اپنے ساتھ لگائے رکھنے کے لیے پروپیگنڈے کے سارے حربے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ چیز اگرچہ بہتوں کو دعوت کے خلاف بدگمانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ لیکن اس دور میں ان لوگوں کو داعی کے اعلیٰ کیریکٹر اور اس کی دعوت کی عقلی قوت کا اپنے لیڈروں کے اخلاق اور ان کی دعوت کی قوت سے موازنہ کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ عوام اپنے سابق لیڈروں سے بدگمان اور نئی دعوت سے متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیرینہ تقلید کی بندشیں فوراً دُور نہیں ہوتیں۔ لیکن اس گروہ کے جری اور بلند سیرت اشخاص آگے بڑھ کر حق پرستی کی راہ کھول دیتے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس طبقہ کا ایک بڑا حصہ حق کی آغوش میں آ جاتا ہے۔

دعوتِ حق کے موافقین

دعوتِ حق کے مخالفین کی طرح اس کے موافقین کی بھی تین قسمیں ہیں:
سابقین اوّلین۔
متّبعین باحسان۔
ضعفاء اور منافقین۔
اب ہم مختصراً ان تینوں جماعتوں کی خصوصیات وصفات پر روشنی ڈالیں گے۔

۱۔ سابقینِ اوّلین

دعوتِ حق کے موافقین میں سب سے اونچا درجہ سابقین اوّلین کا ہے۔ سابقین اوّلین سے مراد وہ گروہ ہے جو کسی دعوتِ حق کے بلند ہوتے ہی اس کو لبیک کہتا ہے اور بے جھجک اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔ یہ ان سلیم الفطرت لوگوں کی جماعت ہوتی ہے جو دعوت سے پہلے بھی اپنے اندر وہی کچھ محسوس کرتے ہوتے ہیں۔
جس کی دعوت ایک داعیٔ حق دیتا ہے یہ عقلی اعتبار سے اتنے بلند ہوتے ہیں

کہ صرف دنیا کے ظاہر پر قناعت نہیں کرتے۔ بلکہ اس کے باطن کے اشارات کو بھی دیکھتے اور سمجھتے ہیں، اور ان کی نگاہ میں حقیقی قدر ان باطنی حقائق ہی کی ہوتی ہے نہ کہ ظواہر کی۔ یہ حیوانوں کی طرح مجرّد خواہشوں کے بندے نہیں ہوتے، بلکہ عقل اور فطرت کے تقاضوں کو جانتے ہیں اور زندگی کے تمام مرحلوں میں ان ہی کو مقدم رکھتے ہیں۔ ان کی عقل اتنی قوی اور فعّال ہوتی ہے کہ وہ باپ دادا کے رسوم اور پرانی روایات کی زنجیروں میں بندھ کر بے بس ہونا کبھی پسند نہیں کرتے۔ یہ ہر بات کے حسن و قبح کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں، اس کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اس کے غث و سمین میں امتیاز کرتے ہیں۔ اور اس میں سے جس چیز کو عقل و فطرت کے مطابق پاتے ہیں، اسی کو قبول کرتے ہیں۔ اور گروہی عصبیتوں اور جماعتی تعصبات کے بندھنوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک نہ سچائی کسی خاص شخص کے دامنوں سے بندھی ہوئی ہوتی، نہ کسی خاص حلقے اور گروہ کے اندر محصور ہوتی اور نہ وہ جائداد کی طرح وراثت میں منتقل ہوتی۔ یہ کسی بات کو حق ماننے کے لیے عقل و فطرت کی تصدیق کافی سمجھتے ہیں، اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ کون اس کا مخالف ہے اور کون اس کے موافق ہے۔ یہ نہ ماضی کے مرید ہوتے، نہ حاضر کے بندے نہ الّا اللہ کے بندے۔ رسولوں کے سوا کسی بڑے سے بڑے مقتدا اور پیشوا کو یہ درجہ دیتے کہ وہ بجائے خود ایک حجت اور سند بن جائے۔

اسی طرح یہ لوگ اخلاقی اور عملی اعتبار سے بھی بہت بلند ہوتے ہیں، ان کی عقل جس چیز کا حق ہونا ان پر واضح کر دیتی ہے، ان کی اخلاقی جرأت ان کو آمادہ کرتی ہے کہ اس حق کو قبول کریں، اور اس کے لیے ہر خطرہ کو گوارا کریں۔ حق کی حمایت کے لیے یہ لوگ نہایت ذکی الحس ہوتے ہیں، ان کے لیے یہ ممکن نہیں

ہو تا کہ وہ حق کو مظلومیت کی حالت میں دیکھیں اور اس کے لیے ان کا دل دردمند ہو، یا اپنے زمانہ کے ہر اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے خود لپکتے ہیں جس میں ان کو اجتماعی فلاح کا کوئی پہلو نظر آئے۔

ان کی غیرت اس بات کو گوارا نہیں کرتی کہ حق کی خدمت کا کوئی کام ہو رہا ہو، دوسرے اس کے لیے زحمتیں اور مصیبتیں جھیل رہے ہوں، جان و مال کی قربانیاں پیش کر رہے ہوں، اور وہ محض ایک خاموش تماشائی کی طرح اس کو دیکھ کر گزر جائیں، یا محض دور سے دو حرف تحسین و آفرین کے کہہ کر اس پر قانع ہو جائیں۔ بلکہ یہ اس کو برپا کرنے کے لیے خود اٹھتے اور اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کے لیے خود سبقت کرتے ہیں۔ یہ بُرے سے بُرے ماحول کے اندر اچھی اور بااخلاق زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس کے لیے اپنے زمانہ کی جاہلیت سے برابر کشمکش کرتے رہتے ہیں۔ جہاں سب کے ہاتھ ظلم اور ناانصافی سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں وہاں یہ عدل و انصاف کے کام کرتے ہیں۔ جہاں یتیموں کا حق مارا جاتا ہے، جہاں لڑکیاں زندہ درگور کی جاتی ہیں، جہاں بیواؤں کو بے یار و مددگار چھوڑا جاتا ہے، وہاں یہ یتیموں کا حق دیتے ہیں، ظالم باپوں کی بیٹیوں کی اپنے خرچ پر پرورش کرتے ہیں۔ بیواؤں کی خدمت کرتے ہیں، جہاں سب جوئے، شراب، زنا، رہزنی اور غارت گری کو ہنر سمجھتے اور ان پر فخر کرتے ہیں۔ وہاں یہ فیاضی خدمتِ خلق، مہمان نوازی، غربا پروری حمایتِ مظلوم اور دوسرے مکارمِ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان میں استکبار کی جگہ تواضع اور حق پسندی کا جذبہ ہوتا ہے۔ حسد کی جگہ راہِ حق میں تنافس اور مسابقت کا ولولہ ہوتا ہے۔ خود غرضی اور مفاد پرستی کے بجائے ایثار اور خدمتِ خلق کا جوش ہوتا ہے۔

یہ اس بات کو بڑی دنائت کی بات سمجھتے ہیں، کہ آدمی ایک نظام کو حق مانتے ہوئے اس کی حمایت سے محض اس وجہ سے جی چرائے کہ اس کا ساتھ دینے میں دنیا کی لذتوں اور راحتوں کو قربان کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح یہ لوگ اس بات کو بھی نہایت رذالت کی بات سمجھتے ہیں کہ آدمی ایک چیز کو باطل تسلیم کر رہا ہو لیکن اس کے ساتھ محض اس وجہ سے چپٹا ہوا رہے کہ اس باطل سے اس کا کوئی دنیوی مفاد وابستہ ہے ان کی مردانہ غیرت پر یہ چیز بڑی شاق گزرتی ہے، کہ ایک امرِ حق کا ساتھ محض اس وجہ سے نہ دیا جائے کہ اس کی وجہ سے کوئی خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ یا یہ کہ باطل بڑا طاقت ور ہے، اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، یا زمانہ کے حالات بہت ناسازگار ہیں اور ان ناسازگار حالات میں حق کا نام لینا خطرات و مصائب کو دعوت دینا ہے۔ اس طرح کے وسوسے ان کے غیور اور باہمت دلوں میں اوّل تو پیدا نہیں ہوتے اور اگر پیدا ہوتے بھی ہیں تو ان کی بلند ہمتی جلد ان کو دُور کر کے ازسرِنو اس کام کے لیے ان کو آمادہ کر دیتی ہے جس کی پُکار ان کے دل کی گہرائیوں سے اُٹھتی رہتی ہے۔

اس طرح کا ایک پاکیزہ گروہ ہر عہد کی جاہلیت کے اندر موجود رہتا ہے۔ برسات کی اندھیری راتوں میں جس طرح جگنو چمکتے ہوتے ہیں اسی طرح اپنے زمانہ کی عام ظلمت کے اندر یہ لوگ چمکتے ہوتے ہیں، اور ان کے دم سے ان کے زمانہ میں روشنی کی ایک نمود باقی رہتی ہے۔ لیکن ان کی قوتیں منتشر ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کو منظم کرنے اور ایک وحدت میں پرونے کے لیے ضرورت ہے کہ کوئی بندۂ حق اُٹھے اور ان سب کو ایک مرکز پر مجتمع کر دے۔

اپنی ان تمام خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود یہ دو وجہوں سے ایک داعیِ حق کے محتاج ہوتے ہیں:۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں حق اپنی مجموعی شکل میں موجود ہی نہیں ہوتا۔ صرف اس کے کچھ اجزاء ہوتے ہیں۔ جیسا کہ انبیاء کے وقفہ کے زمانہ میں ہوتا ہے، ایسے زمانہ میں صالحین کا یہ گروہ ایک درماندگی اور پریشانی کی حالت میں مبتلا رہتا ہے۔ یہ لوگ دنیا کی عام خرابی کو دیکھ کر اس سے کڑھتے تو رہتے ہیں، لیکن یہ نہیں جانتے کہ اس خرابی کی اصلاح کس طرح کریں۔

یہ اپنے زمانہ کی برائیوں سے حتیٰ الامکان اپنے آپ کو الگ تو رکھتے ہیں، لیکن نیکی اور سعادت کی شاہراہ خود ان کے سامنے بھی نہیں ہوتی۔ چہ جائیکہ دوسروں کو اس پر چلنے کی دعوت دے سکیں۔ یہ محسوس تو کرتے ہیں کہ بندگی اور اطاعت کا تنہا حق دار صرف اللہ ہی ہے۔ لیکن خدا کی بندگی اور اطاعت کا طریقہ نہ انھیں خود معلوم ہوتا اور نہ اس کے معلوم کرنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ ہی ہوتا۔ اسی گروہ کے افراد تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش کے دینِ جاہلیت سے بے زار ہو کر اپنے اپنے طور پر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اور خانۂ کعبہ کی دیواروں سے لگ کر نہایت حسرت سے کہا کرتے تھے کہ:

"اے خدا ہمیں نہیں معلوم کہ تیری عبادت کا طریقہ کیا ہے؟ ورنہ ہم اسی طرح تیری عبادت کرتے"۔

ان کے اندر بعض بلند پایہ شاعر تھے، جن کا رنگِ شاعری ان کے زمانہ کی عام اوباشانہ شاعری سے اس قدر الگ تھا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اشعار سن کر تعریف فرمائی کہ:

"یہ شخص مسلمان ہوتے رہ گیا"۔

ان میں بعض بلند رتبہ خطیب بھی تھے جن کے خطبات آج بھی موجود ہیں۔ ان کو پڑھ کر ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ انھوں نے حقیقت کے دروازے پر دستک

ضرور دے دی تھی ۔ اگرچہ اس دروازہ کو کھول نہ سکے ۔ ان میں ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن جحش ، عثمان بن حویرث ، زید بن عمرو بن نفیل جیسے جری لوگ تھے ۔ جو علی الاعلان کہتے تھے کہ :

" یہ کیا بیہودہ پن ہے کہ ہم ایک پتھر کے سامنے سر جھکاتے ہیں، جو نہ سنتا ہے ، نہ دیکھتا ہے ، نہ کسی کا نقصان کر سکتا ہے نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے "۔

یہ لوگ حق کے متلاشی تھے ، لیکن ان کے زمانہ میں پورا حق موجود ہی نہیں تھا ۔ اس وجہ سے یہ محتاج تھے کہ کوئی حق بتانے والا آئے اور ان کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ جوں ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپؐ نے دعوتِ حق بلند کی ، اس طرح کے تمام متلاشیانِ حق ، جو آپؐ کے زمانہ میں موجود تھے ، آپؐ کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے ۔

یہ حق کی لذت سے آشنا تھے ۔ اس وجہ سے حق کو پہچاننے میں ان کو کوئی زحمت پیش نہیں آئی ۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر بات اپنے ہی دل کی بات معلوم ہوئی ۔ یہ ایک راستباز اور کذاب میں آسانی سے امتیاز کر سکتے تھے۔ اس وجہ سے آپؐ کی پاکیزہ سیرت کو دیکھنے کے بعد ان کو گمان بھی نہیں گزرا کہ یہ شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے ۔ وہ آپؐ کی آواز اور آپؐ کے چہرہ سے آپؐ کی نبوت کو پہچان گئے ، اور پکار اٹھے :

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۔	اے ہمارے پروردگار! ہم نے ایک پکارنے والے کو سُنا وہ ایمان کی دعوت دے رہا ہے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لائے ۔
(۱۹۳ - آل عمران)	

چونکہ یہ لوگ اس حق کے لیے منتظر اور چشم براہ تھے ۔ اس وجہ سے اس کو

پاکر انھوں نے بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کیں، بلکہ اس کو دیکھ کر ان لوگوں کے دلوں کا وہی حال ہوا جو اپنے کسی گم گشتہ عزیز کو مدّتوں کے بعد پا کر کسی شخص کا ہوتا ہے:

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝ (۸۳، مائدہ)	جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا جاتی ہیں اس حق کی وجہ سے جس کو وہ پہچان چکے ہوتے ہیں، وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لائے سو ہم کو حق کا اظہار کرنے والوں میں لکھ۔

ان کے انتشار اور بے نظمی کی دوسری وجہ یہ ہوتی ہے کہ حق تو ان کے سامنے موجود ہوتا ہے۔ وہ اس کے مطالبات اور ذمّہ داریوں کو سمجھنے کے لیے کسی نبی کی بعثت اور کسی کتاب کے اُتارے جانے کے محتاج نہیں ہوتے، لیکن ان کی رہنمائی کے لیے کوئی ایسا لیڈر موجود نہیں ہوتا جو ان کی پراگندہ قوتوں کو ایک راہ پر لگا دے۔

ایک بگڑے ہوئے ماحول کے اندر، جب کہ جاہلیت رات کی عالم گیر تاریکی کی طرح چھا چکی ہو، یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ راہ حق یہ ہے، ہر شخص کی ہمّت نہیں ہے کہ قافلوں کی رہنمائی اور قوموں کی رہبری کی ذمّہ داری لینے کے لیے از خود پیش قدمی کرے۔ لیڈری اور امامت کے دلدادہ تو بے شک اندھے ہونے کے باوجود دوسروں کو راہ دکھانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں لیکن صالح لوگ، جو قیادت و امامت کے خیر و شر کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ حتی الامکان یہی کوشش کرتے ہیں کہ اس کارِ عظیم کی ذمّہ داریوں سے اپنے تئیں بچا لے جائیں

وہ اپنی خدا ترسی اور احساسِ ذمہ داری کی وجہ سے اوّل تو اپنے آپ کو تولنے میں نہایت منصف ہوتے ہیں، اور اگر اس تول میں کوئی غلطی کرتے بھی ہیں تو وہ غلطی اپنے نفس کی کی جانب داری میں نہیں ہوتی کہ اپنے ہی پلڑے کو جھکا ہوا رکھنے کی کوشش کریں۔ بلکہ اس کے برعکس غایت احتیاط کی وجہ سے وہ اپنا اندازہ اپنی حیثیت سے کم ہی کرتے ہیں، اپنا اندازہ اپنی حیثیت سے گھٹا کر کرنا احتیاط اور تقویٰ کا ایک لازمی تقاضا ہے۔

نااہل اور ناکارہ اشخاص امارت و سیادت کے جتنے خواہش مند ہوتے ہیں، اہل اور لائق اشخاص اسی قدر اس سے خائف اور ترساں رہتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ میں سے ہر ایک نے سقیفۂ بنی ساعدہ میں، جس طرح اپنے آپ کو خلافت کی ذمہ داریوں سے بچانے کی کوشش کی اس کی تفصیلات بھی ہمارے سامنے ہیں، اور خلافتِ راشدہ کے بعد کے زمانوں میں اسی چیز کے لیے نااہلوں اور بوالہوسوں نے جس طرح ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرائیاں اور خونریزیاں کیں وہ بھی ہمارے علم میں ہیں۔

یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ جن لوگوں کے اندر خدا ترسی ہوتی ہے وہ حتی الوسع کوشش یہی کرتے ہیں کہ آگے چلنے کی ذمہ داری کوئی دوسرا اٹھائے۔ یہ احساس فی نفسہ نہایت مبارک ہے، لیکن اس کی ایک خاص حد ہے، جس سے اگر وہ آگے بڑھ جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صالحین پر انفرادی نیکی کا تصوّر غالب آجاتا ہے اور اقامتِ حق کے لیے اجتماعی جدوجہد برپا کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو خدا کے وہ بندے گوارا نہیں کرتے جو اجتماعی جدوجہد کے فرض کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کی انفرادی نیکیوں اور پراگندہ اور مبہم کوششوں سے دینِ حق کے مطالبات پورے نہیں ہوسکتے۔ یہ احساس جب کسی شخص پر اتنا غالب ہوجاتا ہے کہ وہ اس احساس کو مغلوب نہیں کرسکتا تو وہ اللہ کا نام لیکر

خود اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے اذان دے دیتا ہے۔ یہ اذان ان سارے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے جو نماز باجماعت کے لیے پہلے سے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس سے اس بات پر جھگڑا نہیں کرتے کہ تو نے اذان کیوں دے دی ؟۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اذان کا وقت کب کا ہو چکا ہے، وہ اس بات پر حسد سے جلتے بھی نہیں کہ یہ کام اسی نے کیوں کیا ؟۔ انھوں نے خود کیوں نہ کیا ؟۔

بلکہ اس کے شکر گزار ہوتے ہیں کہ اس نے وہ کام کر دیا جس کے انتظار میں وہ صرف بستروں پر کروٹیں بدلتے رہے تھے، اُٹھنے کی ہمّت نہ کر سکے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ کوئی کامل العیار متّقی اور شب زندہ دار زاہد ہے یا نہیں ؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمام زاہدانِ شب زندہ دار اور متقیانِ کامل العیار سوتے رہے اور وقت کا فرض پہچاننے کی توفیق اسی کو ہوئی۔ وہ اس امر پر بھی نہیں غور کرتے کہ اس نے جس طرح آج کا کام کر دیا ہے کل کا کام بھی کر سکے گا یا نہیں، بلکہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح اس نے آج کا کام انجام دے دیا ہے اسی طرح کل کے کام کو بھی انجام دینے کی توفیق پائے گا۔ اور اگر نہیں پائے گا تو اللہ تعالےٰ کل کے کاموں کے لیے اپنے کسی اور مخصوص بندے کو اُٹھائے گا۔ وہ کس گروہ سے ہے ؟ کس درس گاہ کا فاضل ہے ؟ اس کا ماضی کیا رہا ہے ؟ یہ سارے سوالات اُن کے نزدیک خارج از بحث ہیں۔ اس لیے کہ حقیقت گروہوں اور درس گاہوں کی جائداد نہیں ہے، اور جو حاضر کے فرض کو پہچان چکے ہیں ان کے پاس ماضی کے بخیئے اُدھیڑنے کی فرصت نہیں۔ اس طرح کے صاف ذہن رکھنے والے لوگ، جو پہلے سے اعلاء کلمۃ الحق کا داعیہ رکھتے ہیں، وہ وقت کی اس دعوت میں اپنے درد کی دوا اور اپنی خلش کی شفا پاتے ہیں۔ اس وجہ سے

فوراً اس کو قبول کر لیتے ہیں، اور اس کو کامیاب بنانے کی جد و جہد میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

اس گروہ میں ہر طبقہ کے افراد ہوتے ہیں، امیر بھی اور غریب بھی، جاہل بھی اور عالم بھی، شہری بھی اور دیہاتی بھی، نوجوان بھی اور بوڑھے بھی، عورتیں بھی اور مرد بھی۔ لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو اخلاق کے اعتبار سے کبھی پست رہا ہو۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر اپنے اوصاف کے لحاظ سے پہلے سے ممتاز اور اپنے حلقہ میں دوسروں کا اعتماد حاصل کئے ہوئے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے داعی کو کوئی بڑی جد و جہد نہیں کرنی پڑتی۔ بلکہ یہ ہر گوشہ سے خود کھنچ کھنچ کر داعی کے پاس اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ داعی ان کو تلاش نہیں کرتا، بلکہ یہ داعی کو خود تلاش کر لیتے ہیں۔

یہ پیاسے ہوتے ہیں، اس وجہ سے یہ نہیں چاہتے کہ دریا ان کے پاس جائے۔ بلکہ دشت و جبل کو طے کر کے یہ خود چشمہ کے پاس پہونچتے ہیں۔ ان کی فطرت کا شفاف روغن بغیر اس کو آگ چھوئے بھڑکنے کے لیے مستعد ہوتا ہے۔ اس وجہ سے دیا سلائی کے دیکھتے ہی جل اُٹھتا ہے۔ یہ معجزے اور کرشمے نہیں طلب کرتے، نام و نسب اور شجرہ نہیں دریافت کرتے، لاطائل بحثیں اور حجتیں نہیں کھڑی کرتے، صرف یہ دیکھتے ہیں کہ داعی جس بات کے لیے پکار رہے وہ حق ہے یا نہیں؟ اور اسی راہ پر وہ خود بھی گامزن ہے یا نہیں؟ اگر اس پہلو سے ان کو اطمینان ہو گیا تو وہ پوری دلجمعی کے ساتھ اس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔ آئندہ کے موہوم خطرات کی بنا پر آج کی ایک واضح حقیقت کو نہیں جھٹلاتے، وہ اس بات پر اطمینان رکھتے ہیں کہ جس عقل سے آج حق و باطل میں امتیاز کر کے وہ حق کا ساتھ دے رہے ہیں وہ عقلِ کل بھی ان کے پاس حق و باطل میں امتیاز کے لیے موجود ہوگی، اگر وہ دیکھیں گے کہ کسی مرحلہ میں داعی کی راہ، حق کی شاہراہ سے

منحرف ہو رہی ہے تو وہیں سے اس سے کٹ کر اپنی منزل کھوئے کئے بغیر، وہ حق کی شاہراہ پر اپنا سفر شروع کر دیں گے۔

۲۔ متّبعینِ باحسان

دعوتِ حق کے قبول کرنے والوں کا دوسرا طبقہ "متّبعین باحسان" کا طبقہ ہے۔ اس سے مراد وہ گروہ ہے جو سابقین اوّلین کو دیکھ کر حق کی طرف بڑھتا ہے، یہ لوگ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے سابقین اوّلین کے درجہ کے نہیں ہوتے اس وجہ سے اپنی ذاتی تحریک (INITIATIVE) سے کوئی بڑا قدم نہیں اُٹھا سکتے، اور کسی نئی راہ میں چلنے کے لیے پہل کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ان لوگوں کے اندر قیادت کی صلاحیت نہیں ہوتی، اس وجہ سے دعوتِ حق کی عقلی اور استدلالی قوت اُن کو اتنا نہیں متاثر کرتی جتنا اس کو قبول کرنے والے پیشروؤں کی ہمت و جرأت ان کو متاثر کرتی ہے۔

یہ جب دیکھتے ہیں کہ کوئی دعوتِ حق اٹھی ہے، اس کو کچھ لوگوں نے ہمت کر کے قبول کر لیا ہے، اس کو وہ لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، اور اس کو دنیا میں برپا کرنے کے لیے وہ ہر قسم کے خطرات جھیل رہے ہیں، اور آئندہ جھیلنے کو تیار ہیں تو یہ منظر ان کے دلوں کو متاثر کرتا ہے، اور وہ بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے اپنی ہمت و قوت کو آزمانے لگتے ہیں، ان لوگوں کی استعدادیں مختلف درجہ کی، اور اُن کی رکاوٹیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، اس وجہ سے اس کش مکش میں کچھ عرصہ لگ جاتا ہے۔ لیکن داعیانِ حق کی لگاتار جد و جہد، اور پیش آنے والی مشکلات میں ان کا صبر و استقلال دیکھتے دیکھتے، بالآخر ان کے دلوں کا زنگ بھی صاف ہو جاتا ہے اور وہ ہمت کر کے یکے بعد دیگرے باطل سے ٹوٹ ٹوٹ کر حق کی صفوں میں آملتے ہیں۔

یہ لوگ اگرچہ دعوتِ حق کا ساتھ سابقین اوّلین کی دیکھا دیکھی دیتے ہیں۔ لیکن جب ساتھ دیتے ہیں تو پورا ساتھ دیتے ہیں۔ کسی قسم کی کمزوری، ہچکچاہٹ بزدلی، تھڑدلے پن اور نفاق کا اظہار نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقلی اور اخلاقی اعتبار سے صفِ اوّل کے نہ سہی لیکن صفِ دوم کے بہترین آدمی ہوتے ہیں۔ یہ اپنی خودی کے ضعف کی وجہ سے اپنے عہد کی جاہلیت سے متاثر اور مرعوب ضرور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے اندر حق کا شعور مردہ نہیں ہو چکا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے نظامِ باطل کی گاڑی جب تک کھینچتے ہیں انقباض و تکدّر کے ساتھ کھینچتے ہیں اور اپنے دل کی گہرائیوں میں حق کی حمیّت محسوس کرتے رہتے ہیں۔ نظامِ باطل سے ان کا یہ انقباض کبھی دب جاتا ہے، کبھی اُبھر آتا ہے۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ وہ یک قلم معدوم ہو جائے۔

بلاشبہ اپنے ماحول سے لڑ کر اس کو بدلنے کی ہمّت ان کے اندر نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے ان کو اپنے عہد کے نظامِ باطل پر قانع رہنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کی اس قناعت کی تہہ میں ایک خلش دبی ہوئی ہوتی ہے جو اس وقت لازماً اُبھر آتی ہے جب ان کے سامنے کوئی دعوتِ حق آتی ہے۔ یہ خلش جب بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے تو ہمّت کر کے اسی راہ پر وہ خود بھی چل کھڑے ہوتے ہیں۔ جس راہ پر وہ دوسرے کچھ حق پرستوں کو گامزن دیکھتے ہیں۔ چونکہ ان کا یہ آنا اپنے ارادہ سے ہوتا ہے نہ کسی کے دباؤ سے، اور چونکہ ان کا یہ اقدام ان کی حمیّت کے تقاضے سے وجود میں آتا ہے نہ کسی پوشیدہ خودغرضی کی تحریک سے، اس وجہ سے عزم و بصیرت کا وہ زادِ راہ ان کے پاس موجود ہوتا ہے جو آئندہ مراحل و مشکلات میں ان کے ایمان کی حفاظت کرتا ہے، اور کسی بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی ان کے پاؤں لڑکھڑانے نہیں دیتا۔

ان لوگوں کو حق کی طرف کھینچنے کے لیے داعیٔ حق کو محنت اُٹھانی پڑتی ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ ہم اوپر ظاہر کر چکے ہیں، نہ عقلی اعتبار ہی سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ حق کا پورا تصوّر بغیر عملی مثالوں کے ان کی گرفت میں آجائے، اور نہ اخلاقی اعتبار ہی سے اتنے بلند ہوتے ہیں کہ اس کی حمایت کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اگرچہ ان کے سایہ کے سوا کوئی بھی ان کے داہنے بائیں نہ ہو۔

ان کی ان دونوں کمزوریوں کی وجہ سے لازماً داعی کو ان کے ساتھ کچھ دِنوں تک کش مکش کرتی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہ اس بات کے محتاج ہوتے ہیں، کہ حق ان کے سامنے ایسی وضاحت کے ساتھ کھول دیا جائے، کہ اس کا کوئی پہلو گنجلک اور مبہم نہ رہ جائے۔ جو جو شبہات خود ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کو بھی دُور کر دیا جائے، اور جو شکوک دوسروں کے پیدا کرنے سے پیدا ہو سکتے ہیں حتی الامکان ان کو بھی دور کرنے کی کوشش کی جائے، یہاں تک کہ عقلی اعتبار سے ان کا دل پوری طرح دعوت کی سچّائی پر جم جائے، جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو ان کی اخلاقی جرأت کو شہ دینے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ان کے سامنے عزم و ہمّت کی مثالیں آئیں۔

یہ مثالیں ان کے دل کی قوّت کو بڑھاتی ہیں، ان کے تردّد اور جھجک کو دُور کرتی ہیں۔ مخالف ماحول میں ان کو راہِ حق پر چلنے کا طریقہ بتاتی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی عقل اور ان کا ضمیر دونوں پوری طرح زندہ اور بیدار ہو جاتے ہیں، اور پھر اللہ کی توفیق اگر سہارا دیتی ہے تو وہ راہِ حق پر چلنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

۳۔ ضُعَفَاء اور مُنَافِقِین

ضعفاء اور منافقین کو ہم نے محض ظاہری مشابہت کی وجہ سے ایک

ہی زمرہ میں رکھا ہے۔ لیکن اپنی نیت و ارادہ کے اعتبار سے یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں۔ اس وجہ سے ہم یہاں ان دونوں کی صفات و خصوصیات پر مختصراً علیحدہ علیحدہ بحث کریں گے۔

ضعفاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو حق کو حق سمجھ کر قبول تو کر لیتے ہیں اور نیتاً اسی حق کے مطابق زندگی بھی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان کی قوّتِ ارادی کمزور ہوتی ہے، اس وجہ سے خلوصِ نیت کے باوجود راہِ حق میں لڑکھڑاتے اور ٹھوکریں کھاتے ہوئے چلتے ہیں۔ یہ لوگ بار بار گرتے اور اُٹھتے ہیں۔ لیکن ہر گرنے کے بعد ان کا اٹھنا راہِ حق پر چلنے ہی کے لیے ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ گریں تو پھر اٹھنے کا نام ہی نہ لیں، یا اٹھیں تو اُٹھ کر حق کے بجائے باطل ہی کی راہ پر دوڑیں۔ یہ لوگ اپنی تقصیر کے معترف اور اس پر نادم و شرمسار ہوتے ہیں، اور برابر توبہ و استغفار سے اس کا ازالہ کرتے رہتے ہیں۔ ذہن اور نیّت کے اعتبار سے یہ فروتر نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے ان میں بہتیرے ایسے بھی ہوتے ہیں جو دعوت کے ابتدائی دَور میں اس کو قبول کرنے کی ہمّت کر لیتے ہیں۔ لیکن آزمائش کے موقعوں پر ان کی قوتِ ارادی کا ضعف نمایاں ہوتا رہتا ہے، اور شروع سے آخر تک یہ برابر تربیت و اصلاح کے محتاج رہتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ان ہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے:۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا ؕ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝	اور دوسرے کچھ لوگ ہیں جو اپنے گناہوں کے معترف ہیں، کچھ نیک کام کرتے ہیں اور اس کے ساتھ دوسرے کچھ بُرے کام بھی ان سے صادر ہو جاتے ہیں۔ توقع ہے کہ اللہ ان کی توبہ قبول کرے۔

(توبہ، ۱۰۲) بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان لوگوں کے اندر ہمت و استقامت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کی قوتِ ارادی کے ضعف کے اسباب اچھی طرح تحقیق کر کے اُن کو دُور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اگر اس ضعف کا سبب ذہنی اور عقلی ہے تو ان کو اللہ کی صفتوں، اس کی قدرتوں اور حکمتوں، اور اس کے ان ضابطوں سے آگاہ کیا جائے جن کے مطابق وہ اپنی راہ پر چلنے والوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اگر اس میں طمع دنیا کو دخل ہے تو ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا عادی کیا جائے، تاکہ یہ بیماری دُور ہو، اگر جان کی محبت اور موت کا خوف غالب ہے تو ان پر موت کی قطعیت اور اہلِ حق کے لیے حُسنِ عاقبت کا پہلو اچھی طرح واضح کیا جائے۔

یہ گروہ تعلیم و تربیت سے ضرور فائدہ اُٹھاتا ہے، اس وجہ سے اگرچہ قوتِ ارادی کے ضعف کے باعث ان کی رفتارِ ترقی سُست ہو لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی جگہ ہی پر جمے رہ جائیں اور تربیت سے کوئی فائدہ حاصل نہ کریں۔ ان ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

(توبہ، ۱۰۳)

اور ان کے مالوں میں سے صدقہ قبول کر، تاکہ اس کے ذریعہ سے تو ان کو پاک اور پاکیزہ بنائے، اور ان کے لیے دعا کر، کہ تیری دعا ان کے لیے وجہ سکینت ہوگی، اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

منافقین کا گروہ زبانی اقرار کی حد تک تو دعوتِ حق کا ساتھی ہوتا ہے، لیکن ان کا دل باطل کے ساتھ ہوتا ہے، کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ محض کسی عارضی تأثر سے یہ حق کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ پھر جب راہِ حق کی صعوبتیں اور آزمائشیں آتی ہیں تو اپنی اس غلطی پر پچھتاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جہاں سے آئے ہیں وہیں واپس چلے جائیں۔

لیکن محض جھوٹی شرم کی وجہ سے حق کے ساتھ مجبوراً بندھے رہتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ حق کی طرف آتے ہی شرارت کے ارادے سے ہیں تاکہ اہلِ حق کے کیمپ کے اندر گھس کر فساد کے مواقع تلاش کریں۔ محض دکھاوے کے لیے حق کے ہمدرد و ہواخواہ بن جاتے ہیں۔ حقیقت میں حق کے دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ حق کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر مرعوب ہو جاتے ہیں اور اپنے دنیاوی فوائد کی خاطر کچھ ظاہری لگاؤ اس کے ساتھ بھی قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے محرکات و اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ حق کا اظہار تو کر دیتے ہیں اور ممکن حد تک اس بات کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اس اظہار کو نباہتے رہیں، لیکن قدم قدم ان کی غلطیاں اور شرارتیں حقیقت کے چہرے کو بے نقاب کرتی رہتی ہیں۔

ایک داعیٔ حق کے کام کو سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والا گروہ یہی ہے۔ کھلے ہوئے مخالفین کی مختلف جماعتوں میں سے کوئی جماعت بھی دعوتِ حق کے لیے اس درجہ خطرناک نہیں ہے جس درجہ در پردہ مخالفت کرنے والے "ہمدردوں" کی یہ جماعت ہے، یہ اپنے بن کر بیگانوں کے مقصد کو پورا کرتے ہیں اور ایسی خوبی اور صفائی کے ساتھ پورا کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا اس خوبی اور صفائی سے پورا نہیں کر سکتا۔ یہ داعی

اور دعوت کے خلاف لوگوں میں بے شمار قسم کی غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں، اور چونکہ اپنے سمجھے جاتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اخلاص و ہمدردی کے رنگ میں کہتے ہیں، اس وجہ سے لوگ ان کے پھیلائے فتنوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ جماعت کے درمیان ہمیشہ پھوٹ ڈالنے کے درپے رہتے ہیں۔ اور ہر اس چنگاری کو دبا کر محفوظ رکھتے ہیں جس کو وقت پر ہوا دے کر اس فتنہ کی آگ بھڑکائی جا سکے۔ یہ جماعت کے اندر اس کے دشمنوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں۔ ان کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اڈے بناتے ہیں، اور ظاہر یہ کرتے ہیں کہ یہ خدمتِ حق کے لیے بنائے گئے ہیں۔

یہ حق کے دشمنوں سے حق کی مخالفت کے ارادے سے ساز باز رکھتے ہیں، اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ محض ہمدردی اور خیر خواہی کی نیت سے کر رہے ہیں۔ ہر وہ بات جو اہلِ حق کے لیے حوصلہ شکن ہو ان کو دل سے بھاتی ہے، اور اس کو شہرت دینے میں ان کو خاص مزہ آتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ساری باتیں جو اہلِ حق کی ہمت افزائی کرنے والی ہوں ان کے لیے غم انگیز اور مایوس کن ہوتی ہیں۔ ان کو راہِ حق میں ہر قدم پر خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے اور جماعتی خیر خواہی کے رنگ میں ان کی کوشش برابر یہ رہتی ہے کہ ان خطرات کی ہیبت ہر دل کے اوپر بٹھا دیں۔

یہ اپنی بزدلی اور خست کو چھپانے کے لیے طرح طرح کی تدبیروں سے دوسروں کے جذبۂ فیاضی و قربانی کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حق کے غلبہ کی طرف سے یہ ہمیشہ مایوس رہتے ہیں۔ اور مستقبل کے پردہ میں ان کے نزدیک حق کے لیے مصیبت اور تباہی کے سوا کچھ ہوتا ہی نہیں۔

عملی اعتبار سے یہ لوگ محض صفر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے جماعت

کے اندر اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے بے ثبوت دعاوی، جھوٹی قسموں اور چکنی چپڑی باتوں کو ذریعہ بناتے ہیں۔ حق کی ہر کامیابی کو یہ لوگ حاسدانہ نظر سے دیکھتے ہیں، اور اگر خدانخواستہ اہلِ حق کو کوئی افتاد پیش آ جائے تو اس سے ان کے دل کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

یہ گروہ چونکہ سارا فساد قصد و ارادہ کے ساتھ پھیلاتا ہے اس وجہ سے اصلاح قبول کرنے کی صلاحیت اس میں بہت کم ہوتی ہے۔ اس کے اندر اصلاح صرف وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو محض کسی عارضی اور وقتی غفلت کی وجہ سے دوسروں کی منافقانہ سازشوں میں پڑ کر کوئی منافقانہ حرکت کر بیٹھتے ہیں۔

اس طرح کے لوگوں کے سامنے جب اصل حقیقت آتی ہے، تو وہ ضرور اپنی غلطی پر نادم ہوتے ہیں۔ لیکن جو شر پر شرارت ہی کو کیش و مشرب بنا لیتے ہیں اور اپنے اس پیشہ میں پوری طرح ماہر و مشاق ہو جاتے ہیں۔ وہ اصلاح کی ہر کوشش کو ناکام کر دیتے ہیں، اور اپنے رویہ میں کوئی ادنیٰ تبدیلی بھی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔

ان لوگوں کے بارے میں ایک داعی کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جماعت کو ان فتنوں سے محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کرے اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ جب تک ان کی تعلیم و تزکیہ کو جماعت کی تعلیم و تزکیہ کا ذریعہ بنا سکے، اس وقت تک ان کو جماعت کے اندر گھلے ملے رہنے کی اجازت دے، اور جب یہ مقصد پورا ہو جائے تو ان کو فوراً جماعت سے کاٹ کر علیحدہ کر دے، اور پھر کسی شکل میں بھی جماعت کے ساتھ ان کا کوئی رشتہ باقی نہ رہنے دے۔

دعوتِ حق کے مراحل

ہر دعوتِ حق کو کامیابی کی آخری منزل تک پہونچنے کے لیے بالعموم[۱] تین مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

——— دعوت

——— ہجرت

——— جنگ

اس زمانہ میں لوگ زیادہ تر صرف یورپ، امریکہ، روس اور ٹرکی ہی وغیرہ کے انقلابات سے واقف ہیں، اس وجہ سے سمجھتے ہیں کہ جو مرحلے ان انقلابات میں آئے ہیں وہی ہر انقلاب میں پیش آتے ہیں۔ اور جو طریقے ان انقلابات میں آزمائے جا چکے ہیں وہی ہر انقلاب میں کارگر ہو سکتے ہیں، یہ ایک غلط فہمی ہے،

---

[۱] یہ "بالعموم" کا لفظ خاص طور پر پیشِ نظر رہنا چاہیئے۔ ہر دعوت حق کو کامیابی کی منزل تک پہونچنے کے لیے ان تینوں مرحلوں سے گزرنا لازمی نہیں ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ عام طور پر یہ تینوں مرحلے پیش آتے ہیں، ورنہ اس جمہوریت کے زمانہ میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ صرف پہلا مرحلہ ہی دعوت کو کامیابی سے ہم کنار کر دے۔

جس ہیں لوگ محض اس وجہ سے مبتلا ہیں کہ ان کے سامنے خالص اسلامی طرز کے کسی انقلاب کی تاریخ نہیں ہے۔ ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ حضرات انبیائے کرامؑ یا ان کے طریق پر کام کرنے والوں کی رہنمائی میں جو انقلاب برپا ہوتے ہیں ان کی خصوصیات ان انقلابات کی خصوصیات سے بالکل مختلف ہیں، جو مجرّد سیاسی طرز کی تحریکات سے برپا ہوا کرتے ہیں۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے ہم خالص اسلامی انقلاب کے مختلف مدارج اور اس کے ہر درجہ کی خصوصیات اور تقاضوں پر یہاں بالاجمال گفتگو کریں گے:۔

پہلا مرحلہ ——— دعوت

پہلا مرحلہ دعوت کا مرحلہ ہے۔ ابتداء میں دعوت کا خطاب جس طبقہ کی طرف ہوتا ہے وہ اربابِ اقتدار کا طبقہ ہے۔ لیکن یہ طبقہ اپنی حالت پر بالکل مطمئن اور اپنی دلچسپیوں میں نہایت مگن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے شروع میں یہ لوگ دعوت کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے۔ داعی ہر پہلو سے وقت کے نظامِ فکر، وقت کے نظامِ اخلاق اور وقت کے نظامِ سیاست و معاشرت کی غلطیوں کی نشان دہی کر کے اس انجام کو سامنے لاتا ہے جس سے بالآخر اس باطل نظام کو دوچار ہونا ہے۔ لیکن بظاہر یہ گاڑی تیزی سے چل رہی ہوتی ہے، اس وجہ سے وقت کے اربابِ کار کے لیے یہ باور کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اس گاڑی کے دھرے ٹوٹے ہوئے ہیں اور یہ جلد کسی کھڈ میں گر کے رہے گی۔ جب ظاہری حالات سازگار ہوں تو غافلوں کو کسی نظام کی باطنی کمزوریوں سے متنبہ کرنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ وہ اپنی غفلت و سرمستی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنی کمزوریوں اور خرابیوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتے بلکہ ان کمزوریوں اور خرابیوں ہی کو خوبی اور کمال قرار

دے لیتے ہیں، اور ان لوگوں کو احمق اور بے وقوف بتاتے ہیں جو ان کو خرابی اور بُرائی کہتے ہیں۔

یہ لوگ جس فلسفہ پر کاربند ہوتے ہیں وہ فلسفہ سرے سے کسی چیز کے لیے کوئی اخلاقی بنیاد تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ان کے نزدیک ساری دنیا یا تو بخت و اتفاق کا ایک کرشمہ ہے۔ یا مجرّد طاقت کے محور پر گھوم رہی ہے۔ اس وجہ سے وہ ساری موعظت ان کو لاطائل اور بے معنی معلوم ہوتی ہے۔ جو ایک داعیٔ حق ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان کے بامِ بلند تک اوّل تو غریب داعی کی آواز پہنچ ہی نہیں پاتی، اور اگر پہونچتی بھی ہے تو وہ اس کو ایک صدائے بے ہنگام قرار دے کر سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں، اور بدستور اپنی دلچسپیوں میں منہمک رہتے ہیں۔ انھیں نہ تو اپنے فکر میں کوئی خرابی نظر آتی نہ اپنے نظام میں کسی خلاء کا احساس ہوتا۔ بڑی چیخ پکار کے بعد اگر ان میں سے کوئی اپنے خوابِ خرگوش سے بیدار ہوتا بھی ہے اور اس کو داعی کی کوئی بات اپیل کرتی بھی ہے تو یا تو کبر و خود پرستی کا نشہ اس کو سچّائی کے اقرار سے روک دیتا ہے یا پھر مفاد پرستی اور خود غرضی کی مصلحت غالب آ کر اس کو سُلا دیتی ہے۔ البتہ اس چیخ پکار سے وہ لوگ ضرور متاثر ہو جاتے ہیں، جو سلیم الفطرت ہوتے ہیں اور وقت کے نظامِ باطل سے یا تو بیزار ہوتے ہیں یا کم از کم اس کے ساتھ کوئی مفاد پرستانہ وابستگی نہیں رکھتے۔

یہ لوگ اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے بڑھتے ہیں۔ یہ زیادہ غریب لوگ ہوتے ہیں، جو نہ سیادت و قیادت کے پندار میں مبتلا ہوتے ہیں۔ نہ ان کے سامنے اغراض و مفاد کی حفاظت کا سوال ہوتا، اور نہ ہی ان کے اندر اپنے وقت کے نظام کی حمایت کے لیے کوئی بیجا عصبیت ہوتی۔ یہ ان اسباب و وسائل سے ایک بڑی حد تک محروم ہوتے ہیں۔ جو فتنے میں ڈالنے والے ہوتے ہیں۔ اس وجہ

سے ان کے دل مُردہ نہیں ہوئے ہوتے ہیں، بلکہ کچھ رمق باقی ہوتی ہے اور تھوڑی سی تحریک سے ان کے اندر زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اس گروہ میں سے اوّل حق کی طرف وہ لوگ سبقت کرتے ہیں، جو جوان عمر اور جواں ہمّت ہوتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن میں تصریح ہے کہ ان کی دعوت پر سب سے پہلے ان کی قوم کے کچھ نوجوان ایمان لائے۔

کم و بیش یہی صورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت میں بھی پیش آئی۔ آپؐ کی بعثت کے ابتدائی دور میں جو لوگ ایمان لائے ان میں زیادہ تر نوجوان ہی تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نوجوان کے خون میں حرارت اور ان کے اخلاق میں قوّت ہوتی ہے۔ ان کی حمیّت و غیرت کچھ تو طبعًا بیدار ہوتی ہے، کچھ آسانی سے بیدار کی جا سکتی ہے۔ یہ مخالفتوں سے بہت کم مرعوب ہوتے ہیں، اور مصلحتوں کو بہت کم خاطر میں لاتے ہیں۔ یہ جب کسی بات کا حق ہونا محسوس کر لیتے ہیں تو انھیں اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے قبول کر لینے کے بعد انھیں کن جانی و مالی مصائب سے دوچار ہونا پڑے گا، وہ ان ساری باتوں سے بالکل بے پروا ہو کر اس کو قبول کرتے ہیں اور مصائب کی تلخی ان کے جوش کو سرد کرنے کی بجائے اور زیادہ تیز کرتی ہے۔

دعوت کے ابتدائی دور میں اہلِ حق کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں۔ وہ وقت کے ارباب اقتدار کی پیدا کردہ نہیں ہوتیں۔ اربابِ اقتدار تو، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، شروع میں دعوت اور داعی کا سرے سے کوئی نوٹس ہی نہیں لیتے، اس ابتدائی دور میں ساری مشکلیں اور مزاحمتیں آدمی کے اپنے قریبی ماحول سے سر اٹھاتی ہیں۔ اس دور میں باپ اور بیٹے، ماں اور بیٹی، بھائی اور بھائی، چچا اور بھتیجے، ماموں اور بھانجے، بیوی اور شوہر، خادم اور آقا، مالک اور غلام، استاد اور

شاگرد کی جنگ برپا ہوتی ہے۔ باپ بیٹوں کو قبولِ حق سے روکنے کے لیے ساری نرم وگرم تدبیریں استعمال کرتے ہیں۔ ان کو اپنے حقوق اور اپنی دیرینہ توقعات یاد دلاتے ہیں۔ اپنی مالی مشکلات اور بڑھاپے کا حوالہ دیتے ہیں۔ خود ان کی اپنی ذمہ داریاں اور فرائض سامنے لاتے ہیں، اس راہ کے خطرات و مصائب ایک ایک کرکے گناتے ہیں، خاندان کی تباہی کا رونا روتے ہیں۔ امیدوں کی بربادی کا ماتم کرتے ہیں، اور سب سے آخر میں گھر سے نکال دینے اور جائداد سے محروم کردینے کی دھمکی دیتے ہیں، اور بس چلتا ہے تو ایذا رسانی اور زدوکوب پر اُتر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ کس لیے ؟۔

اس لیے کہ بیٹے نے اگر کسی حق کے قبول کرنے کا ارادہ کیا ہے تو اس سے باز آجائے اور اگر قبول کرلیا ہے تو اس سے برگشتہ ہوجائے، اسی سے ملتا جلتا رویہ ماں کا بیٹی کے ساتھ، بھائی کا بھائی کے ساتھ، چچا کا بھتیجے کے ساتھ، ماموں کا بھانجے کے ساتھ، بیوی کا شوہر کے ساتھ، آقا کا خادم کے ساتھ، مالک کا غلام کے ساتھ اور استاد کا شاگردوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جو جس نوعیت سے جس کے اوپر اقتدار رکھتا ہے اس اقتدار کو حق سے پھیرنے کے لیے استعمال کرتا ہے، اور جس کے جس طرح کے بھی، نسبی، شرعی اور اخلاقی حقوق کسی پر ہوتے ہیں ان کی قیمت وہ صرف یہ مانگتا ہے کہ ان کے معاوضہ میں وہ اس کے اختیار کیے ہوئے باطل کو پوجتا رہے۔ اور اس کے حقوق کے احترام میں سب سے بڑے حق والے (خدا) سے بغاوت کرے۔

اس دور کی مشکلات کا بیان قرآن مجید میں سورۂ عنکبوت میں ہوا ہے، اور ساتھ ہی ان کے حل کے لیے جو اصولی ہدایات درکار ہیں وہ بھی بیان کردی گئی ہیں۔ ہمارے لیے زیادہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، اس لیے صرف ضروری اشارات پر قناعت کریں گے:۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی اُصولی بات یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں اور سچوں میں امتیاز کرنے کے لیے یہ قانون ٹھیرایا ہے کہ اہلِ حق مختلف قسم کی مشکلوں میں ڈال کر آزمائے جاتے ہیں کہ وہ اپنے دعوٰے حق میں جھوٹے ہیں یا سچے ہیں۔ اس وجہ سے انھیں آزمائشوں سے آزردہ اور بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ خندہ جبینی اور استقلال کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے، اور اس بات پر اطمینان رکھنا چاہیئے، کہ اس آزمائش کے کورس سے گزرنے کے بعد کامیابی انہیں کو حاصل ہوگی :۔

الٓمٓ ۞ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ	الٓمٓ، کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا
یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا	ہے کہ وہ مجرد یہ کہنے پر چھوڑ دیئے
وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ۞ وَ لَقَدۡ	جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان
فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ	کی جانچ نہ ہوگی ؟ اور ہم نے ان
فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ	سے پہلے لوگوں کو جانچا، اللہ ضرور
صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ۞	معلوم کرے گا ان لوگوں کو جو سچے
(عنکبوت ۱، ۲)	ہیں اور ان لوگوں کو جو جھوٹے ہیں۔

اس کے بعد اس مزاحمت کے بارے میں اصولی ہدایت دی جو والدین کی طرف سے اہلِ حق کو پیش آتی ہے، اور یہی ہدایت ان تمام حالات پر منطبق ہوگی جہاں قبولِ حق میں مزاحمت کرنے والے یا اس سے پھیرنے والے والدین کی سی منزلت میں ہوں۔ فرمایا :۔

وَ وَصَّیۡنَا الۡاِنۡسَانَ بِوَالِدَیۡہِ	اور ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ
حُسۡنًا ؕ وَ اِنۡ جَاہَدٰکَ لِتُشۡرِکَ	حسنِ سلوک کی ہدایت کی ہے اور اگر
بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡہُمَا ؕ	وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو کسی ایسے کو میرا

(عنکبوت، ۸) ساجھی ٹھہرائے جس کے بارے میں تجھے علم نہیں ہے تو توان کی بات نہ مان۔

یعنی خدا کے حقوق چونکہ والدین کے حقوق سے بڑے ہیں۔ اس وجہ سے جہاں تک خدا کی اطاعت کا تعلق ہے اس میں والدین کی کسی مزاحمت کی پروا کرنا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں والدین اور بزرگوں کی اس جذباتی اپیل کا جواب بھی دے دیا ہے، جو وہ بالعموم نوجوانوں سے کیا کرتے ہیں کہ تم ہمارے مشورے پر چلتے رہو۔ اگر تم اس کو باطل سمجھتے ہو تو عذاب و ثواب ہم بھگت لیں گے، تم پر عذاب و ثواب کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے:۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ وَ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ وَلَيُسْـَٔلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝

(عنکبوت ۱۲، ۱۳)

اور کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا، ان لوگوں سے جو ایمان لائے "تم ہمارے طریق پر چلتے رہو اور ہم تمہاری غلطیوں کے ذمہ دار ہیں" حالانکہ وہ ذرا بھی ان کی غلطیوں کا بوجھ نہیں اُٹھائیں گے، وہ بالکل جھوٹے ہیں، وہ خود اپنے بوجھ اُٹھائیں گے اور اپنے بوجھ کے ساتھ کچھ اور بوجھ بھی، اور قیامت کے دن ان سے اس بات کی بازپُرس ہوگی جو وہ گڑھ رہے ہیں۔

ان اصولی ہدایات کے بعد تین اولوالعزم انبیاء حضرت نوح، حضرت ابراہیم حضرت لوط علیہم السلام کی مثالیں پیش کی ہیں۔ جن کے عملی نمونے اس حقیقت کو

واضح کرتے ہیں کہ ایک بندۂ حق کو اپنے قریب ترین اور محبوب ترین رشتہ داروں کی کی مزاحمت کے مقابلہ میں کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ اور حق کی خاطر رشتہ کی محبّت وعصبیت سے کس طرح بے نیاز ہوجانا چاہیئے۔

سب سے زیادہ محبوب اور عزیز ترین رشتے تین ہیں: بیٹے کا رشتہ، والدین کا رشتہ، بیوی کا رشتہ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے حق کی محبت میں بیٹے جیسی محبوب چیز کے لیے اپنا کلیجہ پتّھر بنالیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی حق کے لیے باپ جیسی شفیق اور محترم ہستی سے اپنی علیحدگی کا اعلان کیا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اسی حق کی خاطر بیوی جیسی محبوب چیز کو چھوڑا۔

بقیہ سارے رشتے ان تینوں رشتوں کے تابع اور احترام ومحبّت میں ان سے فروتر ہیں۔ تو جب حق کی خاطر ان کو کاٹ دینے کا حکم ہوا اور بندگانِ حق نے اس سے دریغ نہیں کیا، تو دوسرے رشتوں اور ناتوں کا کیا ذکر۔

ان مثالوں کو پیش کرنے کے بعد یہ بات بھی واضح کردی کہ اگرچہ خون اور رحم کے ان رشتوں کو کاٹ دینا اپنے بھرے گھر کو اپنے ہاتھوں اُجاڑ دینا ہے لیکن جو لوگ حق کی محبّت میں یہ بازی کھیلنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں، اور جی کڑا کرکے کھیل جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان کے اُجڑے گھر کو بساتا ہے اور جو کچھ وہ کھوتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ تو اس دنیا میں پاتے ہیں، باقی رہیں آخرت کی نعمتیں اور برکتیں تو وہ مزید برآں ہیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مہاجرت کا ذکر کرتے ہوئے اس کی برکتوں کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے:۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ	اور ہم نے اس کو بخشے اسحٰقؑ اور یعقوبؑ
وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِ النُّبُوَّةَ	اور جاری کیا اس کی نسل میں نبوّت

وَالْكِتٰبَ وَاٰتَيْنٰهُ اَجْرَهٗ	اور کتاب کا سلسلہ، اور بخشا اس
فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ	کا اجر دنیا میں اور آخرت میں اور
لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (عنکبوت ۲۷)	وہ نیکوکاروں کے زمرہ میں ہوگا۔

سب سے بڑی چیز جو آدمی کو اس کے قریبی ماحول سے لڑنے میں بزدل بناتی ہے، وہ اس کی معاشی مشکل ہے۔ حق کی خاطر محبت کے رابطوں کو کاٹ دینا بھی بڑے دل وجگر کا کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ہمت کر کے اس گھاٹی کو پار بھی کر لے، تو اس کے بعد اس کو اپنے اس ماحول سے دامن جھاڑ کے اٹھ جانا کچھ آسان نہیں معلوم ہوتا، جس کے معاشی وسائل ہی پر اب تک وہ پلا بڑھا ہے اور جس کے دائرہ سے باہر کی ساری دنیا اس کے لیے بالکل اجنبی اور بے گانہ ہے۔

اس وسوسہ کو دُور کرنے کے لیے قرآن نے اس سورہ میں یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کی بندگی کا حق بہر حال ادا ہونا چاہیے۔ اگرچہ اس کے لیے آدمی کو گھر در سب کچھ چھوڑنا پڑے۔ جو لوگ خدا کی بندگی اور اطاعت کے عشق میں بے خانماں ہوں گے، خدا کی وسیع زمین ان کے لیے تنگ دامن ثابت نہ ہوگی۔ اگر اس راہ میں ان کی موت آگئی (اور موت سب کو آنی ہے) تو ان کے لیے خدا کی بہشت کی جاودانی نعمتیں اور برکتیں ہیں، اور اگر وہ زندہ رہے تو یہ کیوں سوچیں کہ کیا کھائیں گے ؟۔ زمین کا کون سا جاندار ہے جو اپنی روزی اپنے ساتھ باندھے لیے پھرتا ہے؟ لیکن پھر بھی جہاں وہ جاتا ہے خدا اس کو اس کے حصہ کی روزی پہنچاتا ہے، تو انسان تو ان جانوروں کے مقابل میں خدا کی نظر میں بدرجہا زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ آخر وہ اسی کو روزی سے کیوں محروم رکھے گا!۔

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ	اے میرے وہ بندو، جنہوں نے ایمان
اَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَاِيَّايَ	قبول کیا، میری زمین بڑی کشادہ ہے،

فَاعْبُدُوْنِ ۝ كُلُّ نَفْسٍ
ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ قف ثُمَّ اِلَيْنَا
تُرْجَعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ
مِّنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ط نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ق صلے ۝
الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ
يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ
لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ، اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا
وَاِيَّاكُمْ صلے وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝
وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ج فَاَنّٰى
يُؤْفَكُوْنَ ۝ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ
لِمَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَيَقْدِرُ لَهٗ
اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

(عنکبوت ۵۶ ، ۶۳)

تو میری ہی بندگی کرو، ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے، پھر تم کو ہمارے ہی پاس لوٹ کے آنا ہے، سو جو ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے ہم ان کو جنّت کے بالاخانوں میں جگہ دیں گے، اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے، یہ نیک کام کرنے والوں کا کیا ہی عمدہ صلہ ہے، ان کا جنہوں نے ثابت قدمی دکھائی اور اپنے رب پر بھروسہ کرتے رہے، اور زمین میں کتنے جاندار ہیں جن کو دیکھتے ہو کہ اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے، تاہم اللہ ان کو بھی روزی دیتا ہے اور تم کو بھی روزی دیتا ہے اور وہ سننے والا اور جاننے والا ہے، اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کون ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج چاند کو نفع رسانی میں سرگرم کیا؟" تو جواب دیں گے، "اللہ" تو پھر وہ کہاں بھٹک جاتے ہیں، اللہ روزی کشادہ کرتا ہے جس کے لیے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے، بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

جو لوگ اپنے قریبی ماحول کی جنگ میں مضبوط اور ثابت قدم نکلتے ہیں اور حق کی خاطر اپنے خونی اور رحمی رشتوں کی کوئی پروا نہیں کرتے وہ قدرتی طور پر ان لوگوں کے اندر اپنے دل کی وابستگی تلاش کرتے ہیں، جو اگرچہ خون اور نسب میں ان کے ساتھ اشتراک نہیں رکھتے، لیکن فکر و عمل میں ان کے ہم خیال ہوتے ہیں اور ان ہی کی طرح حق کی خاطر اپنے ماحول سے کش مکش میں مشغول ہوتے ہیں۔ انسان کی ساخت فطری طور پر ایسی ہے کہ وہ تنہا نہیں زندگی بسر کر سکتا۔ اس وجہ سے وہ جب اپنے پچھلے تعلقات کی بساط پیٹتا ہے تو لازماً نئے تعلقات کو استوار کرنے کی کوشش کرتا ہے، یہ اس کی ایک فطری ضرورت ہے، جس کے بغیر اس کی زندگی کا صحیح ارتقاء محال ہے، اس وجہ سے اہلِ حق کی جنگ اپنے ماحول سے جتنی ہی سخت ہوتی جاتی ہے ان کے آپس کے رابطے اتنے ہی مضبوط و محکم ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وقت کی سوسائٹی کے اندر یہ ایک مستقل کنبے اور گھرانے کی حیثیت سے ممیز ہونا شروع ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اس قدر نمایاں ہو جاتے ہیں کہ ان کا وجود بحیثیت ایک جمعیت کے محسوس ہونے لگتا ہے اور وقت کا نظام ان کے اثر سے متاثر ہونا شروع ہوتا ہے۔

جب داعیانِ حق اس دَور میں پہونچتے ہیں تب وقت کے اربابِ اقتدار چوکنے ہوتے ہیں، اور انھیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جس چیز کو وہ اب تک صرف چند سر پھرے انسانوں کا وسوسہ اور جنون خیال کرتے رہے ہیں وہ ایک سنجیدہ حقیقت ہے اگر انھوں نے اس کی جلد خبر نہ لی تو اس نظام کی خیر نہیں ہے۔ جس کے وہ علمبردار ہیں، اور جس کے دم سے ان کی تمام عزّت و عظمت قائم ہے۔

اس خطرہ کو محسوس کر کے وہ دعوت کو دبانے کے لیے کمر باندھتے ہیں اور اندھا دھند ظلم شروع کر دیتے ہیں یہ ظلم چونکہ اربابِ اقتدار کا ظلم ہوتا ہے، اس وجہ سے اس میں

وہ سب کچھ ہوتا ہے جو انسان انسان کو ستانے کے لیے کر سکتا ہے۔ دنیا کی پچھلی تاریخ میں اہلِ حق اپنے وقت کے اربابِ اقتدار کے ہاتھوں آگ میں بھونے گئے، تلواروں سے قیمہ کئے گئے، آروں سے چیرے گئے، درندوں سے نچوائے گئے، تپتی ہوئی ریت پر لٹائے گئے، قیدخانوں میں بند کئے گئے، اور اپنے وطنوں سے نکالے گئے۔

اب اگرچہ دنیا فکر و خیال کی آزادی کو بطورِ اصول کے تسلیم کرنے لگی ہے، لیکن جہاں تک کہ اس دعوت کا تعلق ہے، جو زندگی کے سارے شعبوں کو شیطان کی ماتحتی سے نکال کر کے خدا کی اطاعت کے نیچے لانا چاہتی ہے، اس کے علمبرداروں کے لیے آج بھی دنیا کی تاریخ شاید بدلی نہیں ہے۔ ان کو ان تمام حالات سے گزرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جن سے اہلِ حق کو اس سے پہلے گزرنا پڑا ہے:-

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ	کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ جنت
وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا	میں پہونچ جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہارے
مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ	سامنے اس طرح کے حالات نہیں آئے
وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ	جس طرح کے حالات ان لوگوں کو پیش
الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ	آئے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کو
مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ	تنگی اور اذیت کے سارے احوال
قَرِيْبٌ ۝ (بقرہ۔ ۲۱۴)	سے دوچار ہونا پڑا اور پوری طرح جھنجھوڑے

گئے یہاں تک کہ رسول اور وہ سارے لوگ جو اس کے ساتھ ایمان لائے پکار اٹھے "کہ اللہ کی مدد کب آئے گی" اطمینان رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔

یہ دور اہلِ حق کے لیے اگرچہ نہایت سخت ہوتا ہے لیکن اس میں اگر وہ پامردی دکھاتے ہیں، اور وقت کے اربابِ کار کے سارے مظالم کے باوجود اپنی دعوت اور

لپنے مسلک پر ڈٹے رہ جاتے ہیں تو ان کی اخلاقی قوّت کی دھاک ان کے مخالفوں کے دلوں پر بھی بیٹھ جاتی ہے، اور ان کی جماعت اور ان کے مسلک کے لیے وقت کے فکر اور نظام میں اتنی گنجائش نکل آتی ہے کہ جو لوگ کبھی اس دعوت کا ذکر بھی سُننا گوارا نہیں کرتے تھے وہ اس بات کے لیے تگ و دو شروع کر دیتے ہیں کہ کسی طرح کوئی بیچ کی راہ ایسی نکل آئے جس پر دونوں فریق راضی ہو سکیں، اور یہ جھگڑا کسی طرح ختم ہو۔

لیکن اصول کے معاملہ میں سمجھوتے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس وجہ سے اہلِ حق مجبور ہوتے ہیں کہ جس طرح انھوں نے اربابِ اقتدار کے بے تحاشا ظلم کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح ان کی اس خواہش باطل کا بھی مقابلہ کریں، اور ان پر ثابت کر دیں کہ جس مسلک کے وہ داعی ہیں اس سے اِنچ برابر بھی وہ ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں، یہی دَور ہے جس میں اہلِ حق کی رہنمائی کے لیے یہ آیتیں اُتری ہیں :-

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ	جب ان کو ہماری کُھلی ہوئی آیتیں سنائی
قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا	جاتی ہیں تو جن کے دلوں میں ہماری
ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ	ملاقات کی کھٹک نہیں ہے وہ کہتے ہیں
بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا يَكُوْنُ لِيْٓ اَنْ	اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ، یا کم از کم
اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ ج	اس میں کچھ ترمیم کرو، کہہ دو " مجھے کیا حق
اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ج	ہے کہ میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی
اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ	کروں، میں تو صرف اس بات کی پیروی
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ o (یونس، ۱۵)	کرتا ہوں جو مجھے خدا کی طرف سے وحی

ہوتی ہے اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میں ایک بڑے دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں"۔

اہلِ باطل کی اسی خواہش کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے مسلکِ حق کی از سرِ نو وضاحت کرادی گئی، تاکہ سمجھوتہ کی توقع کا یک قلم خاتمہ ہو جائے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَآ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝

(یونس ۱۰۴)

اے لوگو! اگر تم کو میرے دین کے بارہ میں کوئی شک ہے تو سن لو کہ میں ان کی بندگی نہیں کرنے کا جن کو تم خدا کے سوا پوج رہے ہو، بلکہ میں تو صرف اس اللہ کی بندگی کروں گا جو تم کو موت دیتا ہے اور مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں اہل ایمان میں سے بنوں۔ اور یہ کہ تو اپنے رُخ کو یک سو کر دینِ حق کی طرف پھیرا اور مشرکوں میں سے مت بن۔

اس طرح کی سمجھوتے کی دعوتیں بسا اوقات اہلِ حق میں سے بھی بعض لوگوں کو متاثر کر دیتی ہیں اور وہ بھی کسی غلط فہمی کی وجہ سے مصلحت اسی میں سمجھنے لگتے ہیں کہ نرم گرم کچھ سمجھوتہ ہو جائے، ان لوگوں کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے یہ موعظت اُتری:-

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ

جس طرح تجھے حکم ملا ہے اسی طرح ڈٹا رہ اور وہ لوگ بھی جنہوں نے تیرے ساتھ توبہ کی ہے اور راہِ حق سے انحراف نہ ہونے پائے، بیشک تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کو وہ دیکھنے والا

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۚ ○ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ○

(ہود، ۱۱۳ - ۱۱۵)

ہے اور ان لوگوں کی طرف نہ جھکو جنہوں نے ظلم کیا ہے کہ تمہیں بھی جہنم کی آگ پکڑے اور اللہ کے سوا تمہارے لیے کوئی کارساز نہیں۔ پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی اور نماز کو قائم کرو دن کے دونوں حصوں میں اور رات کے کچھ حصہ میں۔ بیشک نیکیاں برائیوں کو دُور کرتی ہیں یہ یاددہانی ہے، یاددھانی حاصل کرنے والوں کے لیے اور ثابت قدم رہو کر اللہ نیکوکاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔

جب اہلِ حق اس دَور سے بھی کامیابی سے گزر جاتے ہیں۔ اور مخالفین کے خوف اور ان کی دعوتِ مصالحت سے متاثر ہو کر دعوت میں کسی کمی بیشی اور ترمیم و تغیر پر راضی نہیں ہوتے، بلکہ اپنی پوری دعوت کو بغیر کسی ترمیم کے پوری یکسوئی کے ساتھ جاری رکھتے ہیں تو اربابِ اقتدار ان کو شکست دینے کے لیے ایک نئی چال چلتے ہیں۔

اب وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح دعوت کے لیڈروں کو طمع کے دام میں شکار کریں۔ اس کے لیے وہ داعیوں کے سامنے وہ سب کچھ پوری فراخ دلی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جو اس دنیا میں چاہا جا سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت، بڑے سے بڑا منصب، وقت کے منافع میں پوری حصہ داری، اور اس کا معاوضہ صرف یہ مانگتے ہیں کہ داعی کسی طرح اس دعوت میں کچھ ترمیم کرنے پر راضی ہو جائے جس نے ان کا چین اور اطمینان غارت کر رکھا ہے۔ یہ خوبصورت بَلا پچھلی تمام خوفناک بلاؤں

سے بھی اہلِ حق کے لیے زیادہ سخت ہوتی ہے۔

چنانچہ امام بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو فتنۂ خلق قرآن کے سلسلے میں خلیفۂ وقت کی طرف سے جب بے تحاشا کوڑے مارے گئے تو انھوں نے ان کوڑوں کی ذرا بھی پروانہ کی، جن کوڑوں کا ذکر کتابوں میں اس طرح آتا ہے کہ اگر اتنے کوڑے کسی ہاتھی کے بھی مارے جاتے تو وہ بھی چیخ اُٹھتا۔ ان کوڑوں کی بارش پر امام کی زبان سے اُف بھی نہ نکلا۔

لیکن جب اس کے بعد خلیفۂ وقت نے امام کی عزیمت سے شکست کھاکر پینترا بدلا، اور کوڑوں کی جگہ ان پر انعام واکرام کی بارش شروع کی تو وہ چیخ اُٹھے کہ "خدا کی قسم یہ انعام واکرام مجھ پر کوڑوں سے بھی سخت ہے۔"

دعوتِ حق کے لیے یہ دَور بڑا ہی آزمائش کا دَور ہوتا ہے۔ کراہتِ موت کے فتنہ سے حُبِّ دنیا کا فتنہ بدرجہا زیادہ سخت و شدید ہے۔ بڑے بڑے اربابِ عزیمت جو لوہے کی زنجیروں کو اپنی ایک ہی جنبش میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں چاندی اور سونے کی زنجیروں کو خود شوق سے زیور کی طرح پہن لیتے ہیں۔ اور پھر کبھی ان سے آزاد ہونے کا دل میں خیال بھی نہیں لاتے۔ خوف کا بھوت جن لوگوں کو مرعوب کرنے سے عاجز رہتا ہے ان کو طمع کا شیطان اس آسانی سے پچھاڑ لیتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ پہلے ہی سے ہمّت ہار بیٹھے تھے، اس دَور کی آزمائشوں کے لیے دعوتِ حق کی تاریخ میں بہترین اسوہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ ہے۔ قریش نے سخت سے سخت مصیبتوں میں آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو ڈال کر جب دیکھ لیا کہ یہ اپنی دعوت سے باز آنے والے ہیں اور نہ اس میں کسی ادنیٰ ترمیم پر راضی ہیں تو آپؐ کے پاس جاکر درخواست کی کہ آپؐ کیا چاہتے ہیں؟ کیا مال و دولت؟ اگر اس چیز کی خواہش ہے تو اس کی زیادہ سے زیادہ مقدار

پیش کرنے کو ہم تیار ہیں۔ کسی معزز گھرانے میں شادی ؟ اگر اس کا ارمان ہے تو ہم میں سے ہر ایک اس بات کے لیے بھی تیار ہے کہ آپؐ کی یہ خواہش بھی پوری کی جائے گی۔ کیا قوم کی افسری اور سرداری ؟ اگر آپؐ اس کا شوق رکھتے ہیں تو ہم یہ جگہ بھی آپؐ کے لیے خالی کیے دیتے ہیں۔ لیکن خدارا آپؐ اپنی اس دعوت کو بند کیجیے، اور باپ دادا کے دین کو بدلنے کی کوشش نہ کیجیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ساری ترغیبات کے جواب میں ایک حرف بھی نہیں فرمایا، بلکہ قرآن شریف کی چند آیتیں ان کو پڑھ کر سنائیں۔ جن میں ان ہی مقاصد کا نہایت مؤثر الفاظ میں اعادہ تھا۔ جن کی دعوت کے لیے آپؐ قریش کے ہاتھوں یہ سب کچھ جھیل رہے تھے، قریش آپؐ کا یہ جواب سُن کر آپؐ سے مایوس ہو گئے۔

اس منزل سے بھی داعیانِ حق جب بخیریت گزر جاتے ہیں تو ایک طرف تو دعوتِ حق، تبلیغ اور اتمامِ حجت کی آخری حد کو پہنچ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ جن کے اندر کچھ بھی اخلاقی رمق باقی ہوتی ہے وہ یا تو علانیہ حق کا اظہار کر کے اہلِ حق کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں یا کم از کم دل سے اس حق کا اقرار کر لیتے ہیں اور اس کے اظہار کے لیے کسی سازگار ساعت کا انتظار کرتے ہیں۔

دوسری طرف دعوتِ حق کے مخالفین دعوت کو دبانے کی تمام کوششوں سے مایوس ہو کر اس کو یک قلم ختم کر دینے کا آخری فیصلہ کر لیتے ہیں اور تمام نتائج سے بے پروا ہو کر داعی اور دعوت سب کو کچل ڈالنا چاہتے ہیں۔

یہی وہ موقعہ ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ کیا گیا، حضرت مسیح علیہ السلام کو سولی پر چڑھانے کی کوشش کی گئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قریش کے تمام اربابِ حل وعقد نے

دارالندوہ میں جمع ہوکر مختلف قسم کی تجویزیں پیش کیں۔ کسی نے کہا آپ کو پابہ زنجیر کر کے کسی مکان میں بند کر دیا جائے۔ کسی نے رائے دی کہ آپؐ کو ملک سے نکال دیا جائے۔ بالآخر ابوجہل کی اس تجویز پر سب کا اتفاق ہوا کہ قریش کے ہر خاندان کا ایک ایک آدمی آمادہ ہو اور سب مل کر ایک ساتھ آپؐ پر تلواریں ماریں، تاکہ آلِ ہاشم آپؐ کے قتل کا بدلہ نہ لے سکیں۔

جب معاملہ اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ داعیانِ حق کے لیے اپنی قوم کے اندر اپنی جان کی حفاظت ناممکن ہو جاتی ہے۔ تب دعوتِ حق برائت اور ہجرت کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

دوسرا مرحلہ ——— برائت و ہجرت

دعوتِ حق کا دوسرا مرحلہ برائت اور ہجرت کا مرحلہ ہے۔ اس کا وقت اس وقت آتا ہے جب داعیانِ حق اپنے ماحول کو دودھ کی طرح بلو کر اس کا مکھن نکال چکتے ہیں اس وقت کی سوسائٹی اخلاقی صفات کے اعتبار سے صرف چھاچھ کے مانند رہ جاتی ہے جن لوگوں کے اندر ذرا بھی صلاحیت ہوتی ہے وہ دعوت کے ہمنوا بن چکنے ہیں، اور جن کے دل بالکل مُردہ ہو چکے ہوتے ہیں وہ دعوت کی مخالفت میں غصہ و نفرت کی آخری حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دعوت کو دبانے یا اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کی تمام توقعات سے مایوس ہو کر وہ اس بات پر کمر باندھ لیتے ہیں کہ داعی اور دعوت کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔

جب یہ وقت آجاتا ہے اور داعیانِ حق محسوس کرتے ہیں کہ اس ماحول کے اندر نہ صرف دعوت و تبلیغ کا کام بلکہ سرے سے سانس لینا ہی ان کے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ تب وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے ماحول سے علیحدگی کا اعلان کریں اور اس کو چھوڑ کر کسی

ایسی جگہ منتقل ہو جائیں جہاں ان کو اپنے مسلک کے مطابق زندگی بسر کر سکنے کی توقع یا کم از کم ایمان پر قائم رہ کر جینا ممکن ہو۔

جہاں تک حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا تعلق ہے اس ہجرت کے وقت اور اس کے مقام، دونوں چیزوں کا تعین ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ براہِ راست رؤیا یا وحی کے ذریعہ سے ان کو عین وقت پر ہدایت فرماتا ہے کہ اب تبلیغ و دعوت کا حق ادا ہو چکا، اور تم کو فلاں وقت یہاں سے نکل کر فلاں مقام پر چلے جانا چاہیئے۔

انبیائے کرامؑ کی بعثت کا مقصدِ اصلی تبلیغِ رسالت اور اتمامِ حجت ہے۔ اس وجہ سے جب تک قوم کے اندر ان کا قیام ضروری ہوتا ہے اس وقت تک اللہ تعالیٰ ان کو قوم کے اندر روکتا ہے، تاکہ تبلیغ کا حق پوری طرح ادا ہو جائے، اور اتمامِ حجت میں کسی پہلو سے کوئی کسر نہ رہ جائے۔ جب یہ حق ادا ہو چکتا ہے تو ان کو ہجرت کی اجازت ملتی ہے۔ اس اجازت کے بغیر ان کے لیے قوم کو چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ بعض حالات میں اس کا امکان ہے کہ شدتِ غیرت یا حمیتِ حق یا کسی اور سبب سے وہ قوم کو چھوڑ کر چلے جائیں اور اتمامِ حجت اور تبلیغ کا فرض ابھی پورا ادا نہ ہوا ہو۔

حضرت یونس علیہ السلام سے اسی طرح کی فروگزاشت ہوئی کہ وہ حمیتِ حق کی وجہ سے قوم کو وقت سے پہلے چھوڑ کر چلے گئے۔ جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔ اور تبلیغ و دعوت کے فرض کو پورا کرنے کے لیے ان کو دوبارہ قوم میں واپس بھیجا۔ اور اس دوبارہ دعوت سے ان کی قوم کا بہت بڑا حصہ مشرف باسلام ہوا۔

انبیاء علیہم السلام کے ماسوا دوسرے داعیانِ حق کو اس ہجرت کے وقت

کا تعین اپنے اجتہاد سے کرنا پڑتا ہے۔ اور چند باتیں اس اجتہاد میں ان کو بحیثیت اصول کے پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہے:۔

ایک یہ کہ ہجرت ہر دعوتِ حق کے لیے کوئی لازمی شرط نہیں ہے۔ بلکہ یہ ضرورت اور حالات کے تابع ہے۔ داعیانِ حق کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ سے لوگوں کو نظامِ حق کا معتقد بنائیں اور جب وہ اس کے معتقد ہو جائیں تو ان کی اجتماعی طاقت سے اس نظامِ حق کو عملاً جاری و نافذ کریں۔ پس جب تک ان کو کسی سرزمین پر اس چیز کا موقع حاصل ہے کہ وہاں کے لوگوں کو پورے دین کی بغیر کسی مجبور کن مزاحمت کے دعوت دے سکتے ہیں، اس وقت تک ان کے لیے وہاں سے ہجرت جائز نہیں ہے۔ اگرچہ اسی کام میں ان کی پوری زندگیاں کھپ جائیں، اور اگرچہ ان کو نہ تو ان کی دعوت قبول کرنے والے ہی ملیں اور نہ ان کو اپنے مسلک کے مطابق کوئی نظامِ زندگی قائم کر سکنے کا موقع ہی میسر آئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے پوری زندگی دعوتِ حق میں بسر کر دی۔ لیکن چونکہ ان کے کام میں بادشاہِ وقت کی عقیدت کی وجہ سے کوئی عملی مزاحمت ایسی نہیں آئی جو ان کی دعوت کے کام کو یک قلم معطل کر دے۔ اس وجہ سے وہ برابر آخر دم تک اپنے کام میں لگے رہے۔ اگرچہ مصر میں ان کو اتنے آدمی نہ مل سکے، کہ وہ ان کی مدد سے وہاں خالص اسلامی اصولوں پر کوئی نظام قائم کر کے چلا سکتے۔

دوسری یہ کہ معمولی درجہ کی مزاحمت و مخالفت کسی ماحول سے ہجرت کے لیے کافی وجہ نہیں بن سکتی۔ ایک ایسی دعوت جو ہر پہلو سے وقت کے افکار و عقائد اور زمانہ کے اصولِ معاشرت و سیاست سے مختلف ہو اس سے فی الجملہ عام لوگوں کی بیزاری و بیگانگی تو ایک قدرتی چیز ہے۔ یہ بیزاری و بیگانگی اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ داعیانِ حق اس سے بد دل ہو کر اس ماحول سے بھاگ کھڑے ہوں۔ اس طرح کی

مخالفتوں کے علی الرغم حضرات انبیائے کرام نے ہمیشہ اپنے کام کو بغیر کسی مایوسی اور بددلی کے جاری رکھا ہے۔

ان مخالفتوں کے مقابل میں صبر و استقامت مخالفین پر اتمامِ حجت کے لیے بھی ضروری ہے۔ اور خود داعیانِ حق کی عزیمت کے امتحان کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ اس چیز کی جانچ کیے بغیر اللہ تعالےٰ کے یہاں نہ تو اہلِ حق کو ان کی حق پرستی کا صلہ ملتا نہ اہلِ باطل کی باطل پرستی پر کوئی عذاب آتا۔ یہ اہلِ حق کے لیے اللہ تعالےٰ کا مقرر کیا ہوا ایک کورس ہے جس سے بہر صورت ان کو گزرنا پڑتا ہے۔ اور اس سے گزر چکنے کے بعد ہی ان کو کامیابی کا تمغہ ملتا ہے۔

البتہ جب قوم کی مخالفت بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اہلِ حق کا وجود اپنے اندر سرے سے برداشت ہی نہیں کر سکتی اور متفقہ طور پر ان کے استیصال کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ اس وقت داعیانِ حق کے لیے یہ بات جائز ہو جاتی ہے کہ وہ ان کے کفر کا فیصلہ کر کے ان سے علیحدگی کا اعلان کر دیں اور وہاں سے ہجرت کر جائیں۔ قرآن مجید میں جتنے انبیاء کی ہجرت کا بیان ہوا ہے، ہر ایک کی سرگزشت سے یہ حقیقت واضح ہے کہ انھوں نے برأت و ہجرت کا اعلان اسی وقت کیا ہے جب ان کی قوموں نے ان کو سنگسار کر دینے، یا قتل کر دینے یا ملک سے نکال دیئے جانے کا آخری فیصلہ کر لیا ہے۔ مخالفین کی طرف سے اس طرح کے اقدام کے بغیر کسی نبی نے بھی ہجرت نہیں فرمائی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام اور داعیانِ حق کی ہجرت اُس فرار سے بالکل مختلف ہے جو ایک قوم دوسری قوم کی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں سے ڈر کر اختیار کرتی ہے۔ یہ فرار ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف ہوتا ہے۔ اور داعیانِ حق کی ہجرت باطل سے حق کی طرف ہوتی ہے۔ اس وجہ سے داعیانِ حق کے لیے ہجرت

سے پہلے دو باتوں کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ جن لوگوں کے اندر سے وہ ہجرت کر رہے ہیں قبولِ حق کے پہلو سے ان کا کیا حال ہے؟ دوسرا یہ کہ جن لوگوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں حق پرستی کے اعتبار سے ان کا درجہ کیا ہے؟ اس جائزہ کے لیے انھیں پہلے اپنے ماحول کی صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا پڑتا ہے کہ حق کی تخم ریزی کے لیے اس زمین میں کوئی صلاحیت باقی ہے یا نہیں۔

اگر وہ اس کے اندر کوئی صلاحیت پاتے ہیں تو اپنی مصلحانہ کوششوں کا سب سے زیادہ حق دار وہ اسی ماحول کو سمجھتے ہیں اور اپنا سارا زور اسی کی اصلاح و تربیت پر صرف کرتے ہیں۔ ہاں اگر پوری طرح امتحان کرنے کے بعد اس پہلو سے اس کا ناکارہ اور بے مصرف ہونا ان پر ثابت ہو جاتا ہے تو باہر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں کہ زمین کا کون سا ٹکڑا اس مقصد کے لیے زیادہ موزوں ہو سکتا ہے، اور جس ٹکڑے پر ان کی نظر انتخاب جمتی ہے وہاں جاکر ڈیرے ڈالتے ہیں اور قسمت آزمائی کرتے ہیں۔

انبیاء کے علاوہ عام داعیانِ حق جس طرح ہجرت کے وقت کا فیصلہ اپنے اجتہاد سے کرتے ہیں اسی طرح انھیں ہجرت کے مقام کا انتخاب بھی اپنے اجتہاد ہی سے کرنا پڑتا ہے۔ اس انتخاب میں جو چیز بطورِ اصل الاصول کے انھیں پیشِ نظر رکھنی پڑتی ہے وہ یہ ہے کہ ہجرت کا مقام دعوت اور مقاصدِ دعوت کے لحاظ سے سازگار ہو، خواہ دوسرے اعتبارات سے اس کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو۔ یہ دار الہجرت ایک چٹیل بیابان بھی ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ریگستان حجاز کی طرف ہجرت فرمائی، دودھ اور شہد کی ایک زرخیز سرزمین بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو ملک شام میں لے گئے۔ اس کی تلاش میں کبھی اپنے وطن سے باہر بھی نکلنا پڑتا ہے، جیسا کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو نکلنا پڑا۔ اور کبھی ایسا بھی

ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی ملک کے کسی گوشہ کو دعوتِ حق کے لیے مہربان اور سازگار بنا دیتا ہے۔ جس ملک میں دعوتِ حق کا ظہور ہوتا ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ میں پیش آیا۔

کسی دعوت کے متعلق آغاز کار میں یہ فیصلہ نہایت دشوار ہے کہ جس زمین میں اس کا بیج بویا جارہا ہے اسی زمین میں اس کی فصل بھی تیار ہوگی، یا بیج تو کسی اور زمین میں ڈالے جارہے ہیں لیکن فصل کسی اور زمین سے کاٹی جائے گی؟ اور وہ زمین کون سی زمین ہوگی؟ ملک سے باہر یا ملک کے اندر؟ کوئی دشوار اور بنجر علاقہ؟ یا کوئی آباد اور معمور خطۂ ارضی؟ جو لوگ حق کی تخم ریزی کے لیے اٹھتے ہیں، ان کے اپنے اندازے اور تخمینے اس بارہ میں کوئی چیز نہیں ہیں۔ ان کی رہنمائی صرف وہ کرتا ہے جس کی رضا جوئی کے عشق میں چند دانے جھولی میں ڈال کر وہ اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ البتہ اتنی بات قطعی ہے کہ حق کے بیج ــــــ اگر ان کے بونے والے اپنے آنسو اور خون سے ان کو سینچنے کے لیے تیار ہوں، ضائع نہیں جاتے۔

اگر زمین کا ایک حصہ اس کی پرورش سے انکار کر دیتا ہے تو کوئی دوسرا گوشہ اس کی پرورش کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر مشرق میں اس کی کھیتیاں شاداب نہیں ہوتیں تو مغرب میں اس کی فصلیں لہلہا اٹھتی اور ایک دن آتا ہے کہ بھرنے والے ان سے کھتے بھر لیتے ہیں اور جمع کرنے والے ڈھیریاں جمع کر لیتے ہیں اور دنیا کی دنیا ان سے سیری اور آسودگی حاصل کرتی ہے۔

اس ہجرت کا مقصد جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں۔ محض مخالفین کی چیرہ دستیوں سے فرار نہیں ہے۔ بلکہ اس سے دعوتِ حق کے چند اہم مقاصد پورے ہوتے ہیں، جن میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے:۔

اس کا پہلا مقصد، اہلِ حق کے اعتقادی مطالبات اور ذہنی تقاضوں کی

عملی تکمیل ہے۔ وہ جس روز سے لذتِ حق سے آشنا ہوتے ہیں اسی روز سے ارادۃً اور نیتۃً مہاجر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے عقائد اور اعمال سے بے زار ہوتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح ان سے دوری حاصل ہو۔

وہ اپنے زمانے کی سوسائٹی سے متنفر ہوتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں، کہ ان کی دلجمعی کے لیے کوئی صالح سوسائٹی ملے۔ وہ اپنے عہد کے نظام کو باطل کا ایک شکنجہ تصور کرتے ہیں، اور خواہش مند ہوتے ہیں کہ اس سے کسی طرح نجات حاصل کریں۔ ان کے باطن کی قوّتِ شامّہ بیدار ہو چکی ہوتی ہے، اور ماحول کے ہر گوشہ سے ان کو بدبو محسوس ہو رہی ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ہر آن وہ کسی ایسی فضا کے متلاشی ہوتے ہیں۔ جس میں وہ آزادی سے سانس لے سکیں اور اس بدبو سے پناہ پائیں۔ وہ اس ماحول میں جتنے لمحے بھی گزارتے ہیں، محض فرضِ تبلیغ کی ادائیگی کے لیے گزارتے ہیں، اس وجہ سے اس فرض کے ادا ہو چکنے کے بعد یہ ان کی ایک فطری ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اس ماحول سے علیحدہ ہو جائیں اور جس چیز کو انھوں نے باطن میں چھوڑ دیا ہے، اس کو ظاہر میں بھی چھوڑ دیں۔

یہ ہجرت کی اصل حقیقت ہے، اور اس حقیقت کے لحاظ سے واقعی ہجرت صرف ان لوگوں کی ہجرت ہے جن کے دل اور جسم دونوں مہاجر ہوں۔ نہ ان لوگوں کی ہجرت ہے جن کے جسم تو ہجرت کر جائیں لیکن دل وہیں اٹکے ہوئے رہ جائیں جہاں سے انھوں نے ہجرت کی ہے۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے ضمیر کے اندر زندگی کی کوئی رمق باقی ہے ان کو حرکت میں لانے کے لیے آخری کوشش کی جائے، جب سوسائٹی کے بہترین افراد ـــــــ جن کا بہترین ہونا ان کے دشمنوں کو بھی تسلیم ہوتا ہے۔ جن کی خیر خواہی اور ہمدردی پر مخالفوں کو بھی اعتماد ہوتا ہے۔ جن کی سچائی اور وفاداری کی اُن

کے اعدار بھی گواہی دیتے ہیں، جن کی حق دوستی اور خدا ترسی پر ان کی ہجویں کرنے والے اور ان کا نداق اڑانے والے بھی دل ہی دل میں رشک کرتے ہیں ——— اپنی سوسائٹی کو اس کے دیرینہ روابط و تعلقات کو اس کے اندر اپنے سارے حقوق اور استحقاق کو، اپنے گھر در کو، اپنی املاک و جائداد کو، یہاں تک کہ اپنے محبوب سے محبوب عزیزوں اور عزیز سے عزیز رشتہ داروں کو چھوڑتے ہیں اور اس طرح چھوڑتے ہیں کہ ان کے دل میں غصہ کے بجائے ہمدردی، نفرت کے بجائے دلسوزی اور غم خواری ہوتی ہے، اور اللہ کی بندگی کے جذبہ کے سوا اس میں کسی ذاتی کدورت اور رنجش کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی نہیں ہوتا تو یہ منظر ایسا نہیں ہے کہ جس میں ذرا بھی انسانی حس موجود ہو اس سے متاثر ہوئے بغیر رہے۔

اس منظر کو دیکھ کر سنگ دل اور شقی مخالفوں کے سوا وہ سارے لوگ حرکت میں آجاتے ہیں جن کے دل کے کسی گوشہ میں حق کی کوئی قدر موجود ہوتی ہے۔ اور ان میں سے بہتیرے اس منظر سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ بالآخر وہ اپنی غلط زندگی پر صبر نہیں کر سکتے، اور اللہ کا نام لے کر راہِ حق کے جانبازوں اور مجاہدوں میں خود بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ داعیانِ حق کی طرف سے اپنی قوم کو گویا آخری بار جھنجوڑنا ہوتا ہے، جس کے بعد ان لوگوں کے سوا جو موت کی نیند سو رہے ہوتے ہیں، اور سارے لوگ اپنے بستروں سے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں[۱]

---

[۱] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جن چیزوں نے اسلام قبول کرنے پر اُبھارا، اگرچہ عام طور پر ان میں سب سے زیادہ اہمیت ان کی بہن بہنوئی کے قبولِ اسلام کو دی گئی ہے۔ لیکن تاریخوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سب سے زیادہ متاثر در حقیقت ہجرت حبشہ نے کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ بہت سے بہترین اشخاص اسلام کے عشق میں ہر قسم کے دُکھ اُٹھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

اس کا تیسرا مقصد اہلِ حق کا تزکیہ ہے۔ داعیانِ حق کے لیے جب تک ہجرت کا مرحلہ پیش نہیں آتا اس وقت تک ان کے مخلص و غیر مخلص میں امتیاز نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگ نفاق کی آلائشیں لیے ہوئے داعیانِ حق کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں اور اپنے نفاق کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے دل کے مخفی گوشوں میں اللہ کے سوا اپنے اعزہ و اقربا یا اپنے مال و جائداد کی کچھ دوسری وابستگیاں بھی رکھتے ہیں، اور یہ چیزیں اس قدر مخفی ہوتی ہیں کہ اپنے دل کے اس چور کی خود انھیں بھی خبر نہیں ہوتی۔

ان لوگوں کے لیے ہجرت ایک کسوٹی کا کام دیتی ہے۔ جس کے بعد کھرے اور کھوٹے میں پوری طرح امتیاز ہو جاتا ہے۔ اللہ کے خالص اور مخلص بندے ایک طرف ہو جاتے ہیں، اور جو لوگ حق کے مخالف ہوتے یا دل میں کوئی چور رکھتے ہیں وہ ایک طرف ہو جاتے ہیں۔ مشہور "پل صراط" کے مانند ہجرت کی راہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، اور اس کو صرف وہی لوگ طے کر سکتے ہیں جو سو فی صدی مومن و مخلص ہوں۔ اگر نفاق اور آلائشِ دنیا کا ادنیٰ شائبہ بھی دل کے اندر چھپا ہوا ہو تو ممکن ہے آدمی دوسری آزمائشوں میں کامیاب ہو جائے۔ لیکن ہجرت کی جانچ میں ضرور پکڑا جاتا ہے۔

چوتھا مقصد یہ ہے کہ ایک آزاد اور پاک فضا میں اہلِ حق کی تربیت و تنظیم

(بقیہ صفحہ گذشتہ) خاطر وہ اپنا وطن چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے ہیں اور ان میں سے بعض ایسے بھی تھے جو خود ان کے مظالم کے شکار ہوئے تھے، تو ان کے دل کی حالت بدلنی شروع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان کی بہن کی استقامتِ حق نے آخری پردہ بھی اُٹھا دیا۔ ابن ہشام میں کئی ایسے واقعے ملتے ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کے دل بدلنے میں سب سے زیادہ دخل ہجرت حبشہ کے واقعہ کو ہے۔

کی جائے تاکہ وہ باطل کے ہاتھوں سے طاقت چھیننے، ایک صالح تمدن کی بنیاد رکھنے اور دنیا کی قیادت وامامت کے منصب کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیار ہوسکیں۔ کافرانہ ماحول جس میں کفر با اقتدار ہو اس مقصد کے لیے کسی طرح صالح وسازگار نہیں ہوسکتا۔

دعوتِ حق کی فطرت اُس پودے کی ہے جو اُگنے کو تو ہر طرح کی زمین میں اُگ جاتا ہے، لیکن نشوونما اسی وقت پاتا ہے جب اس کو وہاں سے اُکھاڑ کر نصب کسی ایسی زمین میں کیا جائے جس پر کسی اور درخت کا سایہ نہ ہو۔ اسی وقت اس کی فطرت کے سارے تقاضے پورے ہوتے ہیں، اسی صورت میں وہ اپنی طبعی رفتار سے بڑھتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن اس کی جڑیں پاتال تک پہنچ جاتی ہیں، اور اس کی شاخیں ساری فضا میں پھیل جاتی ہیں۔ جب تک یہ بات پوری نہ ہولے اس وقت تک دعوتِ حق کی قوتیں ٹھٹھری ہوئی اس کی اصلی صلاحیتیں دبی ہوئی رہتی ہیں۔ اس کے رازوں کا نہ تو اپنوں کو اچھی طرح پتہ ہوتا ہے اور نہ اس کے عجائب اور کرشمے دوسروں ہی پر ظاہر ہوتے۔

کچھ متفرق اصول اپنی جگہ پر کتنے ہی دل کش اور منصفانہ ہوں۔ لیکن ان کے اصلی جوہر کا پتہ نہیں چل سکتا جب تک وہ ایک نظامِ زندگی کے فریم میں دیکھے اور پرکھے نہ جائیں۔ ایک کافرانہ نظامِ زندگی کے تحت توحید، اطاعتِ الٰہی، وحدتِ بنی آدم خوفِ آخرت کا وعظ کہا جاسکتا ہے، اور یہ وعظ بہت سے سلیم الفطرت لوگوں کو متاثر بھی کرسکتا ہے، لیکن جب ان ہی اصولوں کی اساس پر کسی آزاد ماحول میں ایک ہیئتِ اجتماعی وجود میں آجاتی ہے اور اس کے سارے شعبے درجہ بدرجہ اُبھرنے اور اپنا طبعی وظیفہ پورا کرنے لگتے ہیں تو اپنے بھی اس کی صلاحیتوں اور برکتوں کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں، اور دوسرے بھی اس کی قوتوں اور کارفرمائیوں سے ششدر و حیران ہوجاتے ہیں۔

جو ہجرت ان مقاصد اور ان شرائط کے تحت وجود میں آتی ہے اس سے چند نتائج لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں:

اس کا پہلا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہجرت کے بعد دعوتِ حق پوری طاقت و قوت سے بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کلمۂ حق کے اندر بڑھنے اور پھیلنے، غالب آنے اور چھا جانے کی غیر معمولی صلاحیتیں ودیعت ہوتی ہیں۔ انسانوں کی فطرت اور اس کائنات کے مزاج کو اس سے طبعی الفت ہے۔ اور یہ دونوں ہی اس کو پرورش کرنا اور فروغ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن جب تک اس پر باطل کا غلاف پڑا رہتا ہے اس وقت تک یہ اس پودے کے مانند مرجھایا ہوا رہتا ہے جس پر کوئی بیگانہ بیل چڑھی ہوئی ہو اور اس کے رس کو چوس رہی ہو۔ جب اس بیل کے چنگل سے یہ آزاد ہو جاتا ہے اور ایک صالح زمین اور آزاد فضا اس کو مل جاتی ہے تو اس کی ساری دبی ہوئی قوتیں دفعۃً ابھر آتی ہیں، اور آناً فاناً وہ ایک ہونہار درخت کی طرح اپنے ارد گرد کی ساری زمین اور اپنے اوپر کی ساری فضا کی قوتوں کو اپنی غذا بنانا شروع کر دیتا ہے، اور دیکھتے دیکھتے ایک ایسا تناور درخت بن جاتا ہے کہ اس کے سایہ میں قافلے پناہ لیتے ہیں اور قومیں اس کے پھلوں سے غذا اور آسودگی حاصل کرتی ہیں۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل فوراً یا بالتدریج فنا ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باطل کی کوئی اصل اور بنیاد نہیں ہے۔ اس کو نہ تو انسانی فطرت ہی سے کوئی لگاؤ ہے نہ اس نظامِ کائنات ہی سے اس کو کوئی مزاجی مناسبت ہے، اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے ایک مقصدِ حق کے ساتھ بنایا ہے اور اس کے سارے نظامِ تکوینی میں ایک روحِ حق کارفرما ہے۔ اس وجہ سے کسی مجرد باطل کی، جس کے اندر سے حق کے تمام اجزاء نکال کر الگ کر لیے گئے ہوں۔ پرورش کرنا اس کے مزاج کے بالکل منافی ہے، اس کے اندر اگر کوئی باطل پایا جا سکتا ہے تو اسی صورت میں پایا جا سکتا

ہے جب اس کے اندر حق کی بھی کچھ ملاوٹ ہو، کیونکہ یہ باطل طفیلی پودوں یا طفیلی کیڑوں (PARASITES) کی طرح اسی حق کے سہارے جیتا ہے اور جب یہ حق کا سہارا اس سے بالکل ہی چھن جائے جیسا کہ اہل حق کی ہجرت کی صورت میں ہوتا ہے تو پھر باطل کے لیے زندہ رہنا محال ہو جاتا ہے

جس طرح اس جسم کے لیے جس کی روح نکل چکی ہو، سڑ جانا ضروری ہے اسی طرح اُس جماعت کا فنا ہو جانا بھی یقینی ہے۔ جس کے اندر سے اہلِ حق اعلانِ برائت کر کے رخصت ہو چکے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السّلام کے حالات میں ہم پڑھتے ہیں کہ ان کی ہجرت کے بعد اللہ تعالےٰ نے ان کی قوموں کو مہلت نہیں بخشی، بلکہ ان سے دو طرح کا معاملہ کیا گیا ہے۔

اگر ہجرت[۱] کرنے والے اہلِ ایمان تعداد میں بہت تھوڑے ہوئے اور اکثریت اہلِ باطل ہی کی رہی تو اللہ تعالےٰ نے کوئی ارضی یا سماوی عذاب بھیج کر اہلِ باطل کو فنا کر دیا اور زمین کی وراثت اہلِ حق کو سونپ دی۔

اگر ہجرت[۲] کرنے والے اہلِ ایمان کی تعداد معتدبہا اور قابل لحاظ ہوتی تو اس صورت میں اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ خود اہل باطل سے ٹکر لیں اور ان کو حق کے آگے مغلوب کر دیں۔

ان دونوں صورتوں میں حق کا غلبہ اور باطل کی شکست یقینی ہے۔ جس طرح خدا کا عذاب بے پناہ ہے اور اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح اہلِ حق اور اہلِ باطل کا تصادم بھی لازمی حق کے غلبہ ہی پر منتہی ہوتا ہے، اور ممکن نہیں ہے کہ اس تصادم کے واقع ہو جانے کے بعد باطل زیادہ دنوں تک ٹک سکے۔

حضرات انبیائے کرامؑ اور ان کی قیادت میں کام کرنے والی جماعتیں اپنے عہد کے اہل باطل کے لیے خدائی عدالت ہیں، اور وہ پورے انصاف کے ساتھ

حق و باطل میں فیصلہ کرتی ہیں۔ اور باطل کتنا ہی زور آور ہو لیکن اس کو اس عدالت کے فیصلے کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔

جہاں تک انبیائے کرامؑ کا تعلق ہے ان کی ہجرت کے بعد دونوں مذکورہ بالا نتائج لازمی طور پر ظاہر ہوتے ہیں، اور عقل و نقل دونوں اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہی نتائج اس وقت بھی نکل سکتے ہیں۔ جب ٹھیک ان ہی لائنوں پر صالحین کی کوئی جماعت کام کرے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اپنے ماحول پر اتمام حجت کا حق جس طرح انبیاء کرام ادا کرتے ہیں اس طرح اتمام حجت دوسروں سے ممکن نہیں ہے، اس وجہ سے دوسرے اہلِ حق کی ہجرت کے بعد اس طرح کا عذاب آنا ضروری نہیں، جس طرح کا عذاب ان قوموں پر آیا جن کے اندر سے حضرات انبیائے کرامؑ نے ہجرت فرمائی ہے۔ تاہم حق و باطل کی کوئی کش مکش ہو، اگر اس میں اہلِ حق ان تقاضوں کو پورا کریں جو حق کی سربلندی کے لیے ضروری ہیں تو اللہ تعالےٰ ضرور ان کی مدد فرمائے گا اور ان کی جدوجہد بالآخر کامیاب ہو کر رہے گی۔

اس ہجرت کے بعد دعوتِ حق تیسرے مرحلہ یعنی جہاد اور جنگ کے مرحلہ میں داخل ہو جاتی ہے۔

تیسرا مرحلہ ——— جنگ

دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب تبلیغ اور شہادت علی النّاس اور ہجرت کے مرحلے گذر چکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جنگ کے لیے چند ضروری شرطیں ہیں۔ جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہولیں اہلِ حق کے لیے تلوار اٹھانا اور زمین میں خونریزی کرنا ناجائز ہے، اور اگر وہ جلد بازی سے ایسا کر بیٹھیں تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا۔ جس پر اللہ تعالےٰ کے ہاں اجر و ثواب

پانا تو الگ رہا، اُلٹے اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان سے مواخذہ ہو جائے اور وہ فساد فی الارض کے مجرم قرار پائیں۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں :-

— پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا جائے ان پر پہلے پوری طرح حق کی تبلیغ کر دی جائے۔ اس تبلیغ کے بغیر کسی قوم کے خلاف اعلانِ جنگ ناجائز ہے۔ اس کلّیہ سے صرف وہ جنگ مستثنےٰ ہے جو مدافعت و حفاظت میں ہو۔ دفاعی جنگ ہر حالت میں لڑی جا سکتی ہے۔ اس کو افراد بھی لڑ سکتے ہیں اور جماعتیں بھی لڑ سکتی ہیں۔ یہ جنگ تبلیغ کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے جب بھی کسی کی جان و مال اور عزت پر کوئی حملہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں جو قوت بھی اس کے پاس بروقت بہم ہو اس کو استعمال کرے۔ اس راہ میں اگر وہ مارا جائیگا تو اس کو شہادت حاصل ہوگی، اور اگر حملہ آور حریف مارا جائے گا تو اس پر دوہرا گناہ ہوگا۔ ایک اس بات کا کہ اس نے اپنی جان ایک معصیت اور حق تلفی کی راہ میں ہلاک کی۔

دوسرا اس بات کا کہ اس نے ایک صاحبِ حق کی تلوار خون سے آلودہ کرائی، باقی رہی جارحانہ جنگ، تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے۔ جب تک مقدم الذکر شرطِ تبلیغ پوری نہ ہو لے۔ لیکن اس تبلیغ کی دو صورتیں ہیں۔ اور ان دونوں صورتوں میں جنگ کے احکام کی نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔

الف : ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تبلیغ نبی کے ذریعہ سے ہو۔ نبی تبلیغ اور اتمامِ حجت کا کامل ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کی تمام شرطیں کمال درجہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اس عالمِ اسباب میں عقلِ انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ بہتر سے بہتر طریق پر ایک نبی پورا کر دیتا ہے اور اس غرض کے

لیے اللہ تعالیٰ اس کو تمام اسباب و وسائل سے مسلح کر کے بھیجتا ہے، وہ تمام قوم کے اندر کا بہترین شخص ہوتا ہے۔ اعلیٰ ترین حسب و نسب کے ساتھ اُٹھتا ہے۔ وہ نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی پاکیزہ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جھوٹ بہتان مکّاری، بدمعاملگی، ادعائے برتری اور خواہش تفوق کی آلودگیوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کی ان خوبیوں کی شہادت جس طرح اس کے دوست دیتے ہیں اسی طرح اس کے دشمنوں کو بھی اس کے ان فضائل سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ بہترین عام فہم زبان میں اپنی دعوت پیش کرتا ہے۔ اور اس دعوت کو قوم کے بچّہ بچّہ تک پہنچا دینے کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیتا ہے۔ اس کی تعلیم عقل و استدلال کے اعتبار سے اتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ مخالفوں سے اس کا جواب بن نہیں آتا۔ اس کے فیضِ تعلیم و صحبت سے لوگوں کی زندگیاں یکسر بدل جاتی ہیں۔

ظالم اور مفسد، حق شناس اور عدل پسند ہو جاتے ہیں۔ ڈاکو رہزن، نیکوکار اور امن پسند ہو جاتے ہیں۔ زانی اور بدمعاش عفیف اور پاکدامن بن جاتے ہیں۔ شرابی، جواری، پاکیزہ اخلاق اور خدا ترس ہو جاتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو خود کر کے دکھاتا ہے، اور جس قانون و نظام کا داعی ہوتا ہے اس کا سب سے زیادہ پابند و مطیع وہ خود ہوتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی حقیقت کا اپنے ساتھیوں کی زندگی میں مظاہرہ کراتا ہے۔ وہ لوگوں کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے ایک نبی کی تبلیغ اتمامِ حجّت کا آخری ذریعہ ہے۔ اور جب کسی قوم پر نبی کے ذریعہ سے اتمامِ حجّت ہو چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد کسی قوم کے منکرینِ حق کو جینے کی مہلت نہیں دیا کرتا۔ بلکہ لازمی طور پر دو باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہو کے رہتی ہے۔

اگر حق کو قبول کرنے والے تعداد میں تھوڑے ہوتے ہیں اور قوم کا بڑا

حصہ منکر و مخالف رہ جاتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالےٰ اہلِ ایمان کو الگ کر لیتا ہے۔ اور منکرین و مخالفین کو کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر فنا کر دیتا ہے۔ حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اور اگر منکرین کی طرح مومنین کی تعداد بھی معتد بہ اور معقول ہوتی ہے تو اس صورت میں اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ منکرین کے خلاف اعلانِ جنگ کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یہ منکرین توبہ کر کے خدا کے دین کو قبول نہ کر لیں، یا ان کی نجاست سے خدا کی زمین پاک نہ ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اتمامِ حجت کے بعد بنی اسمٰعیل کے خلاف اس قسم کی جنگ کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

یہ قانون جس اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے رسول اس کے قانون مکافات کے مظہر ہوتے ہیں۔ وہ زمین میں خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں اور ان کی بعثت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے، اور اہلِ حق کامیاب و فائز المرام ہوں اور اہلِ باطل ناکام و نامراد ہوں۔ اور چونکہ اس طرح کی سزا و جزا کے لیے ضروری ہے کہ سزا پانے والوں پر خدا کی حجت پوری طرح تمام کر دی جائے۔ اس وجہ سے انبیاء کرام اتمام حجت کے تمام شرائط کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔

یہ شرطیں جب پوری ہو جاتی ہیں تو خدا کا قانون ان لوگوں کو جینے کی مہلت نہیں دیتا۔ جو نری ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں، اور زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سزا چونکہ اس اتمامِ حجت کے بعد دی جاتی ہے۔ جس کے بعد اس دنیا میں اتمامِ حجت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا۔ اس وجہ سے اس کو جبر و اکراہ نہیں قرار دیا جا سکتا، بلکہ یہ عدل و انصاف کا عین مقتضیٰ ہے۔ انبیاء کے ذریعہ سے

اتمامِ حجت ہو چکنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے، ان کے لیے اگر کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ غیب کے پردے اٹھا دیئے جائیں اور ان کو تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا جائے۔

لیکن اس طرح کشفِ حجاب اللہ تعالےٰ کی سنّت کے خلاف ہے، جو اس دنیا میں جاری ہے۔ اس دنیا میں ہم سے ایمان و اسلام کا مطالبہ عقل و استدلال کی بنا پر کیا گیا ہے نہ کہ مشاہدہ اور معائنہ کی بنا پر۔ اس وجہ سے عقل و استدلال کے لیے جو کچھ مطلوب ہے۔ جب انبیاءؑ کے واسطے سے وہ مل چکتا ہے تو اس کے بعد مہلت ملنے کے کوئی معنی نہیں۔ اور اس کے بعد سزا دینے میں جبر کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

ب، دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تبلیغ صالحین کے ذریعہ سے ہو، صالحین کے ذریعہ سے اس درجہ کا اتمامِ حجت ممکن نہیں ہے جس درجہ کا اتمامِ حجت انبیاء کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ نہ یہ ان اسباب و وسائل ہی سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے ہیں جو انبیاءؑ کے پاس ہوتے ہیں، اور نہ ان کی ذہنی اور قلبی حالتیں ہی وہ ہو سکتی ہیں، جو حضرات انبیاء کرامؑ کی خصوصیات میں سے ہیں۔

علاوہ ازیں ان کا شبہات اور بدگمانیوں سے اس درجہ بالاتر ہونا بھی ناممکن ہے جس طرح انبیائے معصومین ان چیزوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ منکرینِ حق کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں، اس کی غایت صرف عدل اور امن کا قیام ہے۔ ان کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول نہ کریں اُن سے جنگ کر کے ان کے ہاتھوں سے اس سیاسی طاقت کو چھین لیں جو ان کی بیماریوں کو دوسرے بندگانِ خدا تک متعدی کر سکتی ہے، اور جتنے سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے، اسی حد پر ان کو رُک جانا چاہیئے۔ اس حد سے آگے بڑھنے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔

اگر اس حدِ متعین سے ایک قدم بھی وہ تجاوز کر جائیں تو اس پر خدا کے ہاں وہ باز پرس کے مستحق ہوں گے۔

اسی طرح کی جنگیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہؓ کے زمانوں میں ہوئیں۔ صحابہؓ اپنی مخالف قوموں کے سامنے تین متبادل چیزیں پیش کیا کرتے تھے:۔

ایک یہ کہ اسلام لاؤ اور اسلام لاکر ہر چیز میں ہمارے برابر کے شریک و سہیم بن جاؤ۔ دوسری یہ کہ اسلامی حکومت کی رعایا بن جاؤ، اور ایک متعین ٹیکس ادا کر کے اپنے پرسنل لا، کے سوا تمام اُمور میں ہمارے نظم کی اطاعت کرو۔ تیسری یہ کہ ہمارے اعلانِ جنگ کو قبول کرو۔

اس صورت میں اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ صحابہؓ کی یہ تبلیغ نہایت اجمالی تھی اور وہ اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ دینِ حق کو لوگوں کے سامنے پیش نہیں کرتے تھے، جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا۔ یا جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو اچھی طرح دلنشیں کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ صحابہؓ کے زمانے میں ایک نظامِ حق عملاً قائم ہو چکا تھا۔ جو رسول اللہؐ کے عہدِ دعوت میں موجود نہیں تھا۔ اس وجہ سے صحابہؓ اسلام کی تفہیم کے لیے کسی تفصیلی تبلیغ سے مستغنی تھے۔ ان کا قائم شدہ نظامِ حق خود اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور وہ بندگانِ خدا سے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس عملی نظام کی وجہ سے ہر حقیقت ان کے زمانہ میں نمایاں اور ہر بات واضح تھی۔

عقیدہ ہو یا عمل، معاشرت ہو یا سیاست ہر چیز ایک مکمل حیاتِ اجتماعی کے پیکر میں دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی، اور ہر شخص اس کو آنکھوں سے دیکھ کر

یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اسلام کا ظاہر و باطن کیا ہے ؟ اور وہ کن اعتبارات سے دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے ؟ اور کیوں اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ باقی رہے اور اس کے سوا دنیا کے سارے نظام مٹ جائیں ؟ اس طرح کا نظام جب بھی دنیا میں قائم و موجود ہو تو وہ اہلِ حق کو تفصیلی دعوت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دے گا، اور مجرّد اس کے قیام کی وجہ سے اہلِ حق کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ لوگوں سے اس کی اطاعت کا مطالبہ کریں، اور اگر لوگ اس مطالبہ سے انکار کریں تو وہ ان سے جنگ کر کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔

اسلام، عدمِ اتمامِ حجت کی صورت میں، جو غیر انبیاء کی دعوت میں متصور ہے، لوگوں کے اس انفرادی حق کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں لیکن وہ کسی گروہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر عادلانہ نظامِ حیات کو لوگوں پر بجبر مسلّط کرے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے۔ کیونکہ اسلامی جہاد دنیا کو فساد سے پاک کرنے کے لیے ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا جہاد کے لیے اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا، جو خود فساد سے آلودہ ہوں۔ یہ کام صرف ان ہی لوگوں کے کرنے کا ہے، اور وہی لوگ اس کو کر سکتے ہیں، جو سو فی صدی اُس مقصد پر ایمان رکھتے ہوں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ تلوار اُٹھائیں، اور ان ہی لوگوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے۔

یہ لوگ اس راہ میں اگر مارے جائیں تو شہید ہوتے ہیں، اور اگر زندہ رہتے ہیں تو غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب کے مستحق ہیں۔ جو لوگ اس حق و عدل پر ایمان نہ رکھتے ہوں، جس کے قیام کے لیے جہاد کا حکم دیا گیا ہے ان کو اسلام ہرگز یہ حق نہیں

دیتا کہ وہ کسی ایک متنفس کا بھی خون بہائیں، اور اگر وہ بہائیں گے تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا اور اس پر ان سے مواخذہ ہوگا۔

اسلامی فوج کرایہ کے آدمیوں سے نہیں بنتی، بلکہ وہ ایسے لوگوں سے مرکب ہوتی ہے جو اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کی خاطر لڑتے مرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اپنے معتقدین ہی کے ذریعہ سے برپا ہو، اور وہی لوگ اس کے برپا کرنے میں ساعی ہوں جو یہ سعی محض رضائے الہٰی کے حصول اور اقامتِ دینِ حق کی خاطر کریں، نہ کہ کسی دنیاوی مفاد کی خاطر۔ اگر ان کی سعی میں حصولِ رضائے الہٰی اور اقامتِ حق کے پاک جذبہ کے سوا کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو نہ صرف یہ کہ ان کی اس سعی کی اسلام کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے بلکہ جو خون بھی اس سلسلے میں انھوں نے بہایا ہے اس کا وبال ان کی گردن پر ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیائے کرامؑ نے جہاد کے اعلان سے پہلے اس فرض کے لیے صالحین کی جماعت بنائی، کرایہ کے آدمیوں کی کوئی فوج نہیں مرتّب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں بعض ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ ایسے لوگوں نے مسلمانوں کی حمایت میں لڑنے کے لئے اپنی خدمات پیش کیں جو اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے، اور محض قومی عصبیت کے تحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امداد کرنا چاہتے تھے آپؐ نے اُن کی پیش کش قبول نہیں فرمائی، اور صاف فرما دیا کہ میں اس کام میں ان لوگوں کی مدد سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا جو اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام نے جو غزوات کئے وہ تمام تر مومنین صالحین کے ذریعہ سے کیے۔

یہی بات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ان کے زمانوں میں جتنے بھی غزوات ہوئے، سب ان ہی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جو اعتقاداً اور عملاً اس چیز

کو تسلیم کرتے تھے جس کو برپا کرنے کے لیے انھوں نے تلوار اٹھائی تھی، اور باوجودیکہ ان کے اثرات بہت وسیع تھے۔ اور وہ چاہتے تو آسانی سے کرایہ کی فوج جمع کر لیتے۔ لیکن نہ صرف یہ کہ انھوں نے کرایہ کی کوئی فوج نہیں بھرتی کی بلکہ خود اپنی بھی کوئی تنخواہ دار مستقل فوج نہیں قائم کی۔ جب جنگ کی حالت پیش آجاتی تو ہر شخص اپنا توشہ اور اپنی سواری لے کر نکلتا اور محض اقامتِ دین کی خاطر جہاد کرتا، اور احتیاط و تقویٰ کی شان یہ تھی کہ عین اس وقت، جب کہ دشمن سے ردّ و بدل ہو رہی ہوتی، اگر کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر جاتا کہ اس وقت حصولِ رضائے الٰہی کے جذبہ کے سوا کسی اور نفسانی جذبہ سے وہ مغلوب ہوگیا ہے تو فوراً ہی اپنی کھنچی ہوئی تلوار میان میں کر لیتا، کہ مبادا یہ کسی انسان کا خون محض نفس کو خوش کرنے کے لیے بہادے[1]

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ ایک با اختیار اور با اقتدار امیر کی قیادت و امارت میں لڑی جائے۔ با اختیار و با اقتدار امیر سے مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار اپنی جماعت پر بزور و قوت قائم ہو۔ وہ لوگوں پر شریعت کے احکام نافذ کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو مجبور کر سکتا ہو، اور خدا کے سوا کسی اور بالاتر اقتدار کا وہ محکوم نہ ہو۔ اس شرط کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ میں سے کسی نے بھی اس وقت تک جہاد کا اعلان نہیں کیا، جب تک انھوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کو کسی آزاد علاقہ میں منظم نہیں کر لیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے بھی اس چیز کا ثبوت ملتا ہے۔ اور آنحضرت

---

[1] اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا بعض حالات میں اسلامی جنگ میں حصہ لے سکتی ہے۔ لیکن اس کے شرائط و حالات بالکل خاص ہیں، یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی دوسری کتاب میں کی ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی اس بات کی شہادت ملتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی جن لوگوں نے انبیائے کرام کے طریقے پر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی۔ مثلاً حضرت سید احمد شہیدؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ۔ انھوں نے بھی اس امر کو پیشِ نظر رکھا اور ایک آزاد علاقہ میں پہنچ کر پہلے اپنی ایک با اختیار امارت بھی قائم کی اور اپنی جماعت کی تنظیم کر کے اس کے اندر شریعت کے تمام احکام و قوانین کا نفاذ بھی کیا۔ اس شرط کی دو وجہیں ہیں:۔

الف: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کسی باطل نظام کے اختلال و انتشار کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جو لوگ اس باطل نظام کو درہم برہم کر رہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظامِ حق قائم بھی کر سکیں گے۔ انارکی اور بے نظمی کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے۔ بلکہ انسانی فطرت سے یہ اس قدر بعید ہے کہ ایک غیر عادلانہ نظام بھی اس کے مقابل میں قابلِ ترجیح ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالےٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو۔ جس کی قوّت و استطاعت غیر معلوم اور مشتبہ ہو، جس پر کسی ایک با اختیار امیر کا اقتدار قائم نہ ہو۔ جس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو، جس کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی نظام کو درہم برہم تو کر سکتے ہوں لیکن اس بات کا کوئی ثبوت انھوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کر سکتے ہیں۔

یہ اعتماد صرف ایک ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے جس نے بالفعل ایک سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو اور جو اپنے دائرہ کے اندر ایک ایسا ضبط و نظم رکھتی ہو کہ اس پر "الجماعت" کا اطلاق ہو سکے۔ اس حیثیت کے حاصل ہونے سے پہلے کسی جماعت کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ "الجماعت" بننے کے لیے جدوجہد کرے۔ اور اس کی یہ جدوجہد جہاد ہی کے حکم میں ہوگی، لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ

عملاً جہاد بالسیف اور قتال کے لیے اقدام شروع کر دے۔

ب :- دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جنگ کرنے والی جماعت کو انسانوں کے جان و مال پر جو اختیار حاصل ہو جایا کرتا ہے وہ ایسا غیر معمولی اور اہم ہے کہ کوئی ایسی جماعت اس کو سنبھال ہی نہیں سکتی جس کے لیڈر کا اقتدار اس کے اوپر محض اخلاقی قسم کا ہو۔ اخلاقی اقتدار اس امر کی کافی ضمانت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے فساد فی الارض کو روک سکے۔ اس وجہ سے مجرّد اخلاقی اقتدار کے اعتماد پر کسی اسلامی لیڈر کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دے۔ ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تلوار چمک جائے گی تو وہ حلال و حرام کے حدود کی پابند نہیں رہے گی، اور ان کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو جائے گا جس کے مٹانے ہی کے لیے اس نے تلوار اٹھائی ہے۔

عام انقلابی جماعتیں جو مجرّد ایک انقلاب برپا کرنا چاہتی ہیں اور جن کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ قائم شدہ نظام کو درہم برہم کر کے برسر اقتدار پارٹی کے اقتدار کو مٹائیں اور اس کی جگہ اپنا اقتدار جمائیں، اس قسم کی بازیاں کھیلتی ہیں اور کھیل سکتی ہیں۔ ان کے نزدیک نہ کسی نظم کا اختلال کوئی حادثہ ہے نہ کسی ظلم کا ارتکاب کوئی معصیت، اس وجہ سے ان کے لیے سب کچھ مباح ہے لیکن ایک عادل اور حق پسند جماعت کے لیڈروں کو لازماً یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ جس نظم سے وہ خدا کے بندوں کو محروم کر رہے ہیں، اس سے بہتر نظم ان کے واسطے مہیا کرنے کی وہ صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں ؟ اور جس ظلم کے مٹانے کے وہ درپے ہیں۔ اس قسم کے مظالم سے اپنے آدمیوں کو بھی روکنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں یا نہیں ؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کو یہ حق .... حاصل نہیں ہے کہ محض اتفاقات کے اعتماد پر وہ لوگوں کی جان و مال کے ساتھ بازیاں کھیلیں اور جس فساد کو مٹانے کے لیے اٹھے ہیں اس سے بھی بڑا فساد خود برپا کرادیں۔

۴۔ چوتھی شرط حصولِ قوت ہے۔ لیکن صالحین کی جماعت کو اس کے لیے کوئی علیحدہ اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ اوپر جو تین شرطیں بیان ہوئی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورے کر دینے سے ضروری قوت خود بخود بہم ہو جاتی ہے۔ ایک صحیح دعوت ہر قوت و استعداد کے آدمیوں کو اپنے ارد گرد مجتمع کر لیتی ہے، اور ان کے واسطے سے سرمایہ بھی بہم ہو جاتا ہے، اور ضروری وسائل کا یا ان کے پیدا کرنے کی قابلیتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ جماعت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ایک آزاد ماحول میں اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ایک بااقتدار امیر کی اطاعت پر جمع کر لیتے ہیں، تو ان کی اخلاقی اور معنوی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے، اور مادی وسائل کے فراہم کرنے اور پیدا کرنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں۔

پس جہاں تک حصولِ طاقت کی سعی کا تعلق ہے، وہ فی الحقیقت ان شرائط کی تکمیل کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس سے علیحدہ اس کے لیے کسی خاص مہم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم جارحانہ جنگ کے لیے قوت کی فراہمی بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت جنگ کا اعلان کر دے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی مجرم ہوگی۔

ان تمام شرائط کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کا مرحلہ شہادت علی الناس اور ہجرت کے مراحل کے بعد کیوں آتا ہے؟ درحقیقت ان دونوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ لوگ متعین ہو کر سامنے آتے ہیں جن سے اسلام میں جنگ جائز ہے اور ان مراحل سے گزر چکنے کے بعد ہی وہ جماعت بھی صحیح معنوں میں وجود میں آتی ہے جس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے امن و عدل قائم کرے، جو لوگ انبیاء کرامؑ کی اس ترکیبِ کار سے واقف نہیں ہیں اور صرف عام انقلابی جماعتوں کے طریقِ کار ہی سے متاثر ہیں ان کو ان تمام مراحل کے فوائد اور نتائج پر غور کرنا چاہیئے۔